مرشد تھانوی

ہندوستان کا عظیم عارف و مصلح

حکیم الامت مجدد الملت حضرۃ مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ

پر چند نادر تحریرات

علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ

ادارہ یادگار گیلانی

سید نا مرشد تھانوی

ہندوستان کا عظیم عارف و مصلح

نذرانۂ عقیدت

علامہ سید مناظر احسن گیلانی

مرتب

محمد عامر قمر

ناشر

ادارہ یادگارِ گیلانی

ایس۔۱۰۔الفلاح سوسائٹی، شاہ فیصل کالونی کراچی

سلسلۂ اشاعت (۲)

جملہ حقوق بحق مرتب محفوظ

نام کتاب: سیدنا مرشد تھانوی (ہندوستان کا عظیم عارف و مصلح)

ازافادات: علامہ سید مناظر احسن گیلانی

مرتب: محمد عامر قمر

دعائے خیر: بحق ناشرین و معاونین ادارہ

طلوعِ اوّل: مارچ ۲۰۱۲ء

قیمت: ۶۰ روپے

ناشر: ادارہ یادگارِ گیلانی

ایس۔۱۰۔الفلاح سوسائٹی، شاہ فیصل کالونی کراچی

موبائل: 0333-3500857

ای میل: mohaqiqgilani@yahoo.com/@hotmail,com

ملنے کے پتے

☆ کتب خانہ مظہری۔اشرف المدارس گلشنِ اقبال بلاک ۲ کراچی

☆ مکتبۂ عمر فاروق، جامع فاروقیہ شاہ فیصل کالونی بلاک ۴ کراچی

☆ مکتبہ ادارہ المعارف، ڈالکخانہ دارالعلوم کراچی ۷۵۱۸۰

☆ ادارۃ الانور، انور مینشن بنوری ٹاؤن کراچی

☆ مکتبۂ رشیدیہ، بالمقابل مسجد مقدس اردو بازار کراچی

فہرست

۱.....پیش لفظ (محمد عامر قمر) 5

۲.....علامہ گیلانی حضرت تھانوی کی نظر میں (حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ) 7

۳.....محقق گیلانی (مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ) 9

۴.....مقدمہ.....حکیم الامت (مولانا عبدالماجد دریا آبادی رحمۃ اللہ علیہ) 11

۵.....تقریرِ تعزیت (علامہ سید مناظر احسن گیلانی) 17

۶.....مولانا تھانوی کی اعتدال پسندی (علامہ سید مناظر احسن گیلانی) 23

۷.....تقریظ والانتقاد.....حکیم الامت (علامہ سید مناظر احسن گیلانی) 30

ضمیمہ

۸.....تھانہ بھون وجہ تسمیہ 35

۱۰.....سیدنا ابوذر غفاری.....پہلی کتاب 35

۱۱.....حضرت حاجی صاحب کی مقبول دعا 36

۱۲.....سید صاحب کی حضرت تھانوی سے بیعت کی خبر 37

۱۳.....تھانہ بھون کی حاضری اور سید صاحب کو مبارک باد 37

۱۴.....اجازت وخلافت کا مفہوم 38

۱۵.....رِند کے رِند رہے ہاتھ سے جنت نہ گئی 39

۱۶.....دیوبندیت کے امتیاز پر بھی قبضہ 40

۱۷.....مولانا تھانوی کے وصال پر تعزیتی خط 40

۱۸.....مولانا تھانوی کا استعفاء 42

۱۹.....حضرت تھانوی کی صحت 42

۲۰.....مولانا عبدالباری ندوی کے خط میں حضرت تھانوی کے حالات 43

۲۱.....حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑنے والا اور حکیم الامت کا صحبت یافتہ 43
۲۲.....حضرت تھانوی سے مراسلت 43
۲۳.....تنقید، تنقید کی غرض سے 44
۲۴.....حضرت تھانوی کا اشاریہ 46

پیش لفظ

کان سے بات سنی اور دل میں اترتی چلی گئی۔ یعنی حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کے سلسلے کا ایک جلسہ اصلاحی وتربیتی ہونا قرار پایا ہے۔ سرپرستی حضرت مولانا شاہ حکیم محمد اختر صاحب دامت زید مجدہم فرمارہے ہیں۔ طالبین، اہلِ شوق یہاں جوق در جوق آئیں گے اور سب اپنے اپنے چھّے کا ''روحانی رزق'' حاصل کریں گے۔ بڑے مبارک ہیں وہ لوگ جو ایسی محفلوں کا اہتمام کرتے ہیں اور اس کے بقا ودوام کی کوشش کرتے ہیں۔ فکر دامن گیر ہوئی، کہ راقم الحروف اس بازارِ صدق وہدایت میں ایسی کون سی جنس پیش کرے۔ قصہ نمرود میں وہ معمولی سی چڑیا ایک غیر معمولی تاریخی حیثیت ونشان بن گئی، جو اپنی چونچ میں بظاہر ایک معمولی قطرۂ آب رکھتی تھی۔ لیکن اس کا عزم واخلاص، سمندروں کے ٹھاٹے مارتے ہوئے جوش سے کہیں زیادہ تھا۔ اس کے سینے میں ایک ایسی ماں کا دھڑکتا ہوا دل تھا، جو ستر ماں سے زیادہ تو نہیں لیکن اس سے کم بھی نہ تھا۔ جب ایک لٹیرے کو ہدایت ملی تو اس کا پس منظر بھی کچھ یوں ہی ہے، کہ درخت کے نیچے ستانے کے لیے اوپر شاخوں کے جھنڈ میں بنے گھونسلے کو تک رہا تھا۔ اس کے حواس نے اس بات پر آمادہ کیا کہ گھونسلے میں کوئی غیر معمولی فعل انجام دیا جارہا ہے۔ وہ دیکھ رہا تھا، کہ ایک معمولی سا پرندہ ایک اندھے بھوکے ناگ کے منہ میں معمولی دانہ ڈال رہا ہے۔ اب میں یہ کیا کہوں، کہ ایک ہفتہ پہلے تک جس کتاب کا کچھ اتا پتا نہ تھا آناً فاناً ایک پوری کتاب نہ سہی لیکن ایک نصف کتاب یا رسالہ بن کر تیار ہوگئی۔ ربِ کریم نے رحمت کا معاملہ کیا اور کچھ چیزیں اس سلسلے کی ملتی چلی گئیں۔ یہ حضرت تھانوی اور علامہ گیلانی کی زندہ کرامت ہے ورنہ اپنی حالت تو یہ ہے، کہ ''نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں''۔ عارفین وصالحین کا تذکرہ یوں بھی رحمتِ الٰہی کے نزول کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی کا معاملہ کرتے ہیں صلحا کی محبت اس کے دل میں ڈال دیتے ہیں۔

علامہ گیلانی نے کچھ چیزیں حضرت تھانوی پر لکھیں، تقریر تعزیت تو انھوں نے حضرت تھانوی کی وفات پر قیامِ دیوبند کے زمانے میں، جب وہ سالانہ مجلسِ شوریٰ کے اجلاس میں شریک تھے، مولانا قاری محمد طیب صاحب (مہتمم) کی فرمائش پر ''ایک تعزیتی تقریر تجھی کو کرنی ہوگی'' فی البدیہہ کہی۔ ''حضرت تھانوی کی اعتدال پسندی'' اور ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' مختصر لیکن افادیت سے بھرپور مضامین ہیں۔ ''حکیم

الامت نقوش وتاثرات" جو، کہ مولانا دریابادی کی خصوصی وصف کی حامل کتاب ہے، اوران کی حضرت تھانوی
" سے پندرہ سولہ سالہ تعلقات پر مبنی ہر طرح کی علمی، تفسیری، اصلاحی اور نجی حالات پر مشتمل ہے۔ کتابوں کے
ہجوم اور مبالغے کے اس دور میں "حکیم الامت" ایک مخصوص صنف کا درجہ رکھتی ہے، جس کا جی چاہے تجربہ کر
کے دیکھ لے۔ علامہ گیلانی کا یہ مضمون اسی کتاب پر ایک انتقاد ہے۔ ان کے مطبوعہ خطوط اور ان کی دیگر
تالیفات میں جہاں جہاں حضرت تھانویؒ کا ذکر آیا ہے اسے بھی جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں ایک
اشاریہ بھی دیا گیا ہے جس میں ایک اہلِ دل نے ایک اہلِ دل کے متعلق اس کے نام اور اس کی کتابوں کے
حوالے، اور اس سے بحث واستدلال خصوصاً "قصص الاکابر" اور "الہادی" وغیرہ۔

مقامِ حیرت ہے، کہ ان کی "خودنوشت احاطۂ دارالعلوم میں بیتے ہوئے دن" میں حضرت تھانوی
کے ذکر سے عاری ہے۔ حالانکہ وہ اپنے دوسرے دیوبندی اساتذہ پر صفحات پر صفحات لکھتے چلے گئے۔ اور اس
سے بھی زیادہ تعجب ان کی اس خودنوشت کا پینتیس چالیس سال تک گوشۂ گمنامی میں پڑے رہنا ہے۔ جیسے
انھوں نے اس طرح کی کوئی تحریر لکھی ہی نہ ہو یا ان سے لکھوائی ہی نہ ہو۔ (یادش بخیر! یہ کتاب مدیر دارالعلوم
کے بے حد اصرار پر لکھی گئی)۔ ارباب دارالعلوم ہی اس کی وضاحت کریں گے، یہ تو صرف ایک مثال ہے۔

علامہ گیلانی نے اس کا برملا اعتراف کیا ہے، کہ ان (حضرت تھانوی) کے بعض اقوال نے بعض
اسلامی حقائق کے سمجھنے میں میری بڑی رہنمائی کی ہے۔ اسی طرح حضرت تھانوی اُن کے متعلق کہتے ہوئے
پائے جاتے ہیں (دارالعلوم کے صحن کا یہ جملہ بہت مشہور ہے)، کہ "مناظر احسن کے تمام مناظر، احسن ہیں"۔
ہمارے آپس کے معاصرانہ علمی وذاتی تعلقات کے حوالے سے یہ کتنی چشم کشا حقیقت ہے۔ دارالعلوم کا نام
آتے ہی ایک علم وفکر اور تحریک وعمل کی داستان رقم ہو جاتی ہے۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اس کے اوّلین معمار
اور حضرت تھانویؒ اس کے نقشِ ثانی، اوران دونوں کو پیش کرنے والے علامہ گیلانی، تو آیئے دیکھتے ہیں، کہ وہ
کیا کہتے ہیں۔ "سیرت بانیِ دارالعلوم" (مولانا محمد قاسم نانوتوی) اور مرشد تھانوی کے درمیان تقریباً تیرہ چودہ
برس کا فصل ہے۔ ناظرینِ کتاب سے التماس ہے، کہ مرتب ھذا اور ادارے کے حق میں دعا کریں، کہ یہ فصل
وصل سے بدل جائے۔ علامہ گیلانی کے اسی طرح کے کئی منصوبوں پر ہم کام کر رہے ہیں۔ انشاءاللہ اپنے وقت
پر وہ بھی پیش ہوں گے، بے عیب خدا کی ذات ہے غلطیاں ابنِ آدم کے خمیر میں ہیں۔ نشاندہی کیجیے انشاءاللہ
دور کی جائے گی۔ باقی یار زندہ صحبت باقی۔

محمد عامر قمر (۲۷/ مارچ ۲۰۱۲)

علامہ گیلانی حضرت تھانوی کی نظر میں

لیکن اب میں کن الفاظ میں ان تعجب آمیز انبساطی احساسات کا اظہار کروں، جب اچانک امام الملت، حکیم الامت، سیدی الامام مولانا اشرف علی التھانوی قدس سرہ العزیز کے ایک گرامی نامے سے اسی مضمون کے متعلق پہلی دفعہ چونکایا گیا۔ حضرت والا سے شفاہی لقاء کی سعادت اس وقت تک نصیب نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اور بھی تعجب ہوا۔ گو چند سطروں ہی کا وہ عنایت نامہ تھا لیکن حضرت والا نے اس خط کو بھی ایک مستقل نام عطا فرمایا تھا۔ اور جسے عزت بخشی گئی تھی، وہ بھی ایک خاص خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اسی زمانے میں ''القاسم'' کی کسی اشاعت میں اس ''مکتوب گرامی'' کو شائع بھی کر دیا گیا تھا۔ اور اس وقت بھی موقع تھا، کہ میں اس فیضِ نامہ کو یہاں بجنسہ درج کرتا، لیکن افسوس ہے، کہ باوجود تلاش کے ''القاسم'' کے پرانے فائل میں وہ شمارہ نہ ملا۔ کاش! میری اس آرزو کی تکمیل کوئی صاحب آئندہ زمانہ میں فرمادیں۔ بہرحال جو کچھ یاد رہ گیا ہے اب اسی پر قناعت کرتا ہوں خط کا نام سمجھیے یا عنوان، یہ تھا۔

خطاب من ھذا الفقیر الناظر

الیٰ کتاب السید مناظر

جس لقب سے سرفرازی بخشی گئی تھی وہ یہ تھا یعنی خطاب کا آغاز ان الفاظ سے فرمایا گیا تھا:

''الیٰ سیدالکاتبین احسن اللہ مناظرہٗ.....''

مضمون کے جس حصہ کو پڑھ کر اس خاص عنایت کی طرف حضرت والا کو جو توجہ ہوئی ہے اس کے بعد اس کا ذکر تھا۔ ارقام فرمایا گیا تھا، کہ:

''اس مضمون کا لکھنے والا اگر محقق ہو چکا ہے تو یہ مضمون اس کی محققیت کی دلیل ہے، ورنہ محققیت متوقع کی دلیل ضرور ہے''۔

اصل مکتوب چونکہ سامنے نہیں ہے اس لیے ہوسکتا ہے، کہ الفاظ میں تقدیم وتاخر کا اختلاف

پیدا ہو گیا ہو لیکن الفاظ انشاء اللہ یہی تھے۔ مجھے یہ بھی یاد پڑتا ہے، کہ ''مجاذیب و بہالیل'' جو مسلمانوں کے فقراء کی عام قسم ہے، اس باب میں فقیر نے جن خیالات کا اظہار اور جن مستند مآخذ کو اس سلسلہ میں پیش کیا تھا، اس پر خصوصیت کے ساتھ زیادہ شاباشی عطا فرمائی گئی تھی۔ بلکہ خیال آتا ہے، کہ بطور وصیت کے یہ بھی ارقام فرمایا گیا تھا، کہ آئندہ ان کی مشہور کتاب ''الکشف'' کو جو صاحب شائع کریں، اس میں مضمون کے اس حصے کا بھی اضافہ کر دیں، واللہ اعلم۔

اس وصیت کی تعمیل کی گئی یا نہیں، اور یہ پہلی بشارت تھی جو اپنے عہد کے ایک مجدد کے ذریعے سے اس مضمون کی کیفیت کے متعلق مجھ تک پہنچی۔

(ابوذر غفاری، ص، ۸۔۹)

☆☆☆

محقق گیلانی

(۱۸۹۲ء.....۱۹۵۶ء)

نام دیوبند کے سلسلے میں عرصے سے سن رہا تھا اور دو ایک مضمون بھی پڑھ چکا تھا۔ خیال یہ ہو رہا تھا، کہ بڑے مناظر، جدال پسند اور بحّاث قسم کے عالم ہوں گے۔ پرانی اصطلاح میں ''معقولی'' زیارت جب اوّل اوّل حیدرآباد میں ہوئی، مولانا عبدالباری کے ساتھ تو نقشہ ہی دوسرا نظر آیا۔ بڑے ہنس مکھ، وجیہ، شکیل، نرم مزاج، نرم رو، اور چہرے پر داڑھی تو خاص طور پر ملائم و خوش نما، بال ریشم کی طرح نرم اور چہرے پر خشونت و کرختگی کہیں نام کو نہیں۔ نمازِ عشا کا وقت آیا تو آواز بھی سُریلی اور مترنم، درد و گداز لیے ہوئے سننے میں آئی۔ قرأت شاید سورۃ الملک کے دوسرے رکوع کے نصف آخر کی تھی۔ جوں ہی انھوں نے ''افمن یمشی مکبّا علیٰ وجھه'' سے شروع کی معلوم ہوا کسی نے دل مل دیا ہے۔ حالانکہ میں از سرِ نو اسلام لانے کے بعد بھی ابھی تک پختہ نہیں ہوا تھا۔ تعلقات یگانگت اسی وقت سے بڑھنے شروع ہو گئے اور ان کی عمر برابر بڑھتے ہی گئے۔ حج میں ساتھ رہا، ایک ایک منزل کی رفاقت مادی و روحانی ہر سطح کی رفاقت سے کئی درجے اور بڑھ گئی۔ مولانا دریابادی بھی آئے۔ لکھنؤ میں، اعظم گڑھ میں، حیدرآباد میں، پٹنہ اور خاص گیلانی (ضلع پٹنہ، موجودہ نالندہ) میں بارہا ملاقاتیں رہیں۔ اور آپس میں کسی قسم کا تکلف باقی نہ رہا۔ میری بیوی سے جو رشتہ عرفاتی بہن کا انھوں نے لیا، اسے آخری وقت تک نباہ دیا۔ ہر خط میں ضرور ذکر ان عرفاتی بہن کا کرتے۔ مولانا کی ذہانت، ذکاوت، حافظے کے کرشمے بارہا دیکھے۔ نعتیہ نظمیں خوب کہتے اور خوب تر انداز سے پڑھتے۔ ہر مصرع کے ساتھ دلکشی اور جاذبیت بڑھتی ہی جاتی۔ بہار کی ہندی (مگدھی) زبان پر بھی قدرت انھیں حاصل تھی۔ اور ایسی قدرت، کہ بے تکلف فارسی مصرعوں پر بلکہ عربی مصرعوں پر بھی۔

تحریر میں جو بانکپن تھا اس سے کچھ ہی کم تقریر میں بھی تھا۔ موضوع کوئی سا بھی دیجیے، پس یہ معلوم ہوتا، کہ خیالات کا دریا ہے، کہ اُبلتا اور اُمنڈتا چلا آرہا ہے۔ کہاں کہاں سے مضمون پیدا کر لیتے، اور

نکتہ سنجی اور دقیقہ آفرینی، قرآنی عنوانات میں اور زیادہ نمایاں ہوتی۔ اور قرآن کے بعد ہی نمبر حدیث کا رہتا۔ ایسی نکتہ سنجیوں کو اب کان ترس گئے ہیں۔

ماشاءاللہ کتابیں اچھی خاصی تعداد میں چھوڑ گئے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، تدوینِ حدیث، تدوینِ قرآن، حیاتِ قاسمی، مقالات احسانی، النبی خاتم وغیرہ۔

انتقال گویا دفعتاً ہوا۔ وہیں گیلانی میں (ضلع مونگیر) اپنے وطن میں۔ سگے بھائی کا بیان ہے، کہ یہ کرامت دیکھنے میں آئی، کہ عین انفکاک روح ہوتے ہی، داڑھی کے سفید بال ایک دم سیاہ ہو گئے اور چہرہ بالکل جوان آدمی کا معلوم ہونے لگا..... میری جذباتی زندگی جن چند لوگوں سے خصوصاً وابستہ تھی ان میں سے ایک مولانا بھی تھے۔ عجب نہیں، کہ اگر میرے نصیب میں جنت لکھی ہوئی ہے تو مجھے لینے کے لیے مولانا خود آئیں۔

(معاصرین، ص ۱۸۲۔۱۸۳)

حواشی: یہ عنوان خود مولانا دریا آبادی کا ہے دیکھیے وفیات ماجدی۔

☆☆☆

مقدمہ

حکیم الامت

(۱۸۶۳ء.....!۱۹۴۳ء)

بزرگ میں نے اپنی عمر میں بہت دیکھ ڈالے اور تذکرے بھی بہتوں کے اس تفصیل واستناد سے سنے، کہ گویا انھیں دیکھ بھی لیا۔ عابد وزاہد بھی چلّہ کش ومرتاض بھی، صاحبِ کشف وکرامات بھی، ان میں یقیناً بہت سے اچھے لوگ بھی ہوں گے۔ اللہ کے برگزیدہ، جنتی اور مغفور، لیکن مصلح، مربی، اصلاح کرنے والا، اور تربیت سے لگانے والا حضرت تھانوی کا مثیل ونظیر کوئی نظر سے نہیں گزرا اور نہ سننے میں آیا۔

شیخ کی تلاش، جب سے میں از سرِ نو مسلمان ہوا (تقریباً ۱۹۲۰ء سے) جب ہی سے تھی۔ جس کا نام سنتا، اس کی طرف لپکتا، اور اسی ہوس میں ایک مشہور شیخ سے بیعت بھی کر لی۔ حضرت تھانوی کا شروع شروع بالکل معتقد نہ تھا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے، کہ سیاسی اختلافات کی بنا پر دل کو آزردگی سی تھی۔ اور مریدین نے تشدد کے وہ قصّے بیان کر رکھے تھے، کہ نام سے وحشت ہونے لگی تھی۔ ۱۹۲۷ء تھا، کہ ایک محترم دوست (سید مقبول حسین وصل بلگرامی) نے حضرت کے کچھ چھپے ہوئے وعظ پڑھنے کو دیے۔ اور کہا، کہ تجربتاً ہی ذرا ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔ بے دلی کے ساتھ ان پر عمل شروع کیا، لیکن اب کیا بیان ہو، کہ پہلی ہی نشست میں دل لگنے لگا، اور ایک ایک بات دل میں اترنے لگی۔ مولانا کا رنگ صوفیوں، عارفوں سے الگ نظر آیا۔ شوق بڑھا، وعظ پر وعظ لے کر مانگ کر پڑھے۔ اور بے اختیار خط وکتابت شروع کر دی۔ سارا قصہ طویل ہے، اسے چھوڑیے۔

جولائی ۱۹۲۸ء میں تھانہ بھون حاضری کی اجازت مل گئی۔ آمد ورفت شروع ہوگئی۔ دیکھا تو دید شنید سے بھی بڑھ کر رہی۔ اور زیارت سماعت سے کہیں بہتر نکلی۔ کشش اس درجے کی، کہ طبیعت ملنے

سے ہرگز نہ اکتائے۔اور مل جانے پر رخصت کا جی نہ چاہے۔تھانہ بھون ایک پرانا قصبہ شیخ زادوں کا ضلع مظفر نگر میں ہے۔لکھنؤ سے جایئے تو سہارن پور ہو کر۔اور فاصلہ سہارن پور سے کوئی دو ڈھائی گھنٹے کا اتفاق سے کچھ ہی روز بعد بھائی صاحب کا تبادلہ سہارن پور کا ہو گیا۔اور اس سے قدرتاً سفر اور قیام دونوں میں بڑی سہولت ہو گئی۔اور سفر بار بار ہونے لگا۔بھائی صاحب کا قیام سہارن پور میں چار پانچ برس رہا۔ اور میرا سفر تھانہ بھون کوئی پندرہ بیس بار تو ضرور ہوا۔کبھی مختصر دو ایک دن کا، اور کبھی طویل مہینے سوا مہینے کا۔ مختصر میں حضرت مولانا کا ذاتی مہمان ہوتا اور طویل میں ایک مکان مستقل لے لیتا۔کبھی تنہا ہوتا اور کبھی رفیقِ زندگی کو رفیقِ سفر بنا لیتا۔خیر! میرے لطفِ سفر کا تو کہنا ہی کیا، گھر والی بھی ساتھ جا کر بڑی محظوظ و مسرور ہوتیں۔ایک آدھ بار ایسا بھی ہوا، کہ والدہ مرحومہ اور ہمشیرہ مرحومہ وغیرہ سارے گھر بار کو سہارن پور سے لے کر گیا۔اور سب بہت خوش آئے۔

۱۹۲۸ء سے ۱۹۴۳ء (حضرت کا سالِ وفات) تک پندرہ سولہ سال، سلسلہ آمد و رفت کا برابر رہا۔اور مراسلت بھی اچھی خاصی جو ہوئی وہ اس کے علاوہ۔اخیر کے دو چار سال حضرت اپنی علالت و نقاہت کے باعث لکھنؤ دو تین بار تشریف لائے۔یہ ایک ذریعہ مستزاد ہو گیا۔میں دریا باد سے اکثر سفر کر کے لکھنؤ حاضری دے لیتا تھا اور ان گھڑیوں کو اپنی زندگی کی بہترین ساعتوں میں سمجھتا ہوں۔اور اپنی قسمت پر خود ہی رشک کر لیا کرتا ہوں۔آہ! وہ دن جواب کبھی نہ آئیں گے۔حرم شریف اور حرمِ کعبہ کو چھوڑ کے مدینہ منورہ کے بعد ایسی لطافت، ایسی نظافت، ایسی نورانیت اور کہاں۔کیسی الٹی سمجھ والوں نے حضرت مولانا کو ''خشک'' مشہور کر دیا۔اور اس شہرت کا ایک سبب تو خود حضرت کے مریدین ہی کی ایک جماعت ہوئی ہے۔جس کے نزدیک نظم و انضباط کا نام خشکی تھا۔حالانکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بڑے ہی لطیف المزاج ہوئے ہیں۔اور قرآن مجید نے آپ کے ''غلیظ القلب'' ہونے کی نفی کامل فرمائی ہے..... بے شک مزاج میں حرارت وحدّت تھی (جس طرح آپ کو نسبی نسبت فاروق اعظم سے تھی) لیکن آپ اس کا استعمال موقع اصلاح پر تادیب ہی کے لیے کرتے تھے۔میں نے آپ کو صحت و مرض، قوت و ضعف، حزن و نشاط کے ہر موقع پر دیکھا ہے۔اس لیے آنکھوں دیکھی شہادت دے رہا ہوں نظم و انتظام کے تو آپ بادشاہ ہی تھے۔افراط و تفریط اکثر بزرگوں اور اولیائے امت میں جو ہوا کرتی

ہے کوئی کسی خصلت میں بہت بڑھا ہوا اور کوئی کسی خصلت میں۔ توازن واعتدال حضرات انبیاء کا خاصا ہوتا ہے۔ اسی سیرت انبیائی کی جھلک آپ میں دیکھنے میں آئی۔ ہر کام اپنے وقت پر۔ ہر چیز اپنی مقررہ جگہ پر کھانے پینے، چلنے پھرنے، سونے جاگنے، اٹھنے بیٹھنے، سب کے ضابطے، سب کے آداب، ہر گفتگو ایک مقصد لیے ہوئے، بے مقصد گفتگو جیسے جانتے ہی نہ تھے۔ زبان پر اتنا قابو میں نے کسی بزرگ کا نہ پایا۔ اوراوراد و وظائف پر جو زور دوسرے آستانوں پر رہتا ہے اس کا یہاں نام ہی نہ تھا۔ رسوم سے اجتناب، نمائشی تکلفات سے احتراز، بس اپنے کام سے کام، دوسروں کو زحمت سے بچانے کا کامل اہتمام، بندوں کی خدمت عبادت کے درجے میں، بس یہی خصوصیات مجلسِ اشرفی کے دیکھنے میں آئے۔

اب بہت بڑی بات کہنے جارہا ہوں، وہ بہ ظاہر ایک بہت چھوٹے سے منہ سے نکل رہی ہے لیکن بات کو دیکھیے کہنے والے کو نہ دیکھیے۔ حکیم الامت سے اللہ نے سلوک وطریقت کی وہ خدمت لی ہے جو آج تک بڑے سے بڑے صوفیہ اور مشاہیر اولیاء سے بن نہیں پڑی تھی۔ یعنی افعال انسانی کی بنیادی تقسیم اختیاری وغیر اختیاری کے درمیان۔ اور اسی تقسیم کے بعد، کوئی بھی فعل بہ ظاہر کتنا ہی گندہ اور قبیح ہو، اگر پورے اختیار سے سرزد نہیں ہوا، تو اس کا شمار فسق ومعصیت میں سرے سے ہوگا ہی نہیں۔ معصیت کی سنگینی کا معیار تو صرف بشری ارادہ واختیار ہے، تو اب بدتر سے بدتر عمل بھی اگر ہر رات اور ساری عمر، عالمِ رویا میں کرتا رہے تو اس سے معصیت ایک بار بھی نہیں لکھی جائے گی۔ اس لیے، کہ عمل ہزار بار کا بھی کیا ہوا شعور وارادے کے تحت واقع نہیں ہوا۔ آنکھ اگر نماز کے وقت نہ کھلی تو تدارک کے لیے بس نماز کا قضا پڑھ لینا کافی ہے یہ کوئی گناہ ہوا ہی نہیں۔ اس لیے، کہ عمل ارادی تھا ہی نہیں۔ جس کا کفارہ لازم آئے۔ ایک ایسی بنیادی مسئلے نے لاتعداد جزئی مسائل طے کر دیئے اور بے شمار الجھنوں سے بچالیا۔ بجا ہے، کہ اگر کوئی اسی حقیقت کی بنا پر حضرت کو اشرف الاولیاء قرار دے دے۔

چونکہ اوقات بڑے مرتب ہوتے تھے، وقت کے لمحات ضائع نہیں ہونے پاتے تھے، اللہ نے وقت میں برکت بھی بڑی عطا فرمائی تھی۔ جوانی بھر تدریسی کام کرتے رہے، اس کے باوجود بھی تصانیف ومواعظ کی تعداد دہائیوں سے گزر کر پچاسوں تک پہنچ گئی۔ اور چھوٹے بڑے تقریباً ہر موضوع پر آپ کچھ

لکھ ضرور گئے۔ کتابوں اور مقالوں سے بڑے بڑے ضخیم مجلدات تک، یہی حال کیفیت وکمیت کے لحاظ سے وعظوں سے کا بھی ہے۔ وعظ آپ کے سینکڑوں کی تعداد میں ضرور ہوں گے۔ اوران میں بیشتر طبع ہو چکے ہیں۔ فرق تصانیف ومواعظ میں صرف یہ ہے، کہ کتابیں جو ہیں وہ عموماً اہلِ علم ہی کے لیے لکھی گئی ہیں۔ اس لیے اصلاً طلبہ فن کے لیے ہیں۔ اور عام فہم نہیں رہی ہیں۔ بہشتی زیور قسم کی کتابیں اس سے مستثنیٰ اور عام فہم ہیں۔ برخلاف اس کے واعظوں میں ان کے مخاطب عوام وخواص، ہر سطح واستعداد کے لوگ ہوتے تھے، اس لیے ان کا بیشتر حصہ عام فہم اور سلیس ہے۔ نافع اپنی جگہ تصانیف ومواعظ دونوں، اور تعداد اگر غیر مطبوعہ نسخوں کی بھی ملالی جائے تو کتابوں اور وعظوں کا مجموعہ سینکڑوں سے گزر کر ایک ہزار کے لگ بھگ تو ضرور پہنچ جائے۔ حکمت اور توازن کا ہنر وسلیقہ مندی زندگی کے ہر چھوٹے سے چھوٹے جزئیہ میں نمایاں ہوتی۔

حضرت بطور میزبان بھی ایک مثالی قسم کے انسان تھے۔ یہ نہیں، کہ بس اندھا دھند بس رسمی ''خاطر داری'' ہی کرنے چلیں اور مہمان کی اصل راحت، سہولت، ذوق طبعی اور معمولات کا لحاظ کیے بغیر، بس اپنی طرف سے اصرار ہی کرتے چلے جائیں۔ ایک بار کیا ہوا، کہ میں سہارن پور سے کوئی قریب نو بجے صبح کے چل کر گیارہ بجے پہنچا۔ حضرت کے ہاں کھانے کا وقت بھی تھا، فرمایا ''کھانا کھاؤ گے؟''۔ میں نے عرض کی، کہ ''کھا کے تو چلا تھا''۔ سکوت فرمایا، اور مجھ سے اصرار نہ کیا۔ میں نے ''کھانا'' تو اصطلاحی معنیٰ میں کھایا نہ تھا۔ ناشتہ البتہ خوب ڈٹ کر کرلیا تھا جو کھانے ہی کا کام دے۔ گرمی کا موسم تھا غالباً جون کا مہینہ تھا۔ اس وقت بھوک واقعی بالکل نہ تھی۔ کچھ دیر بعد خواہش زرا معلوم ہونے لگی کوئی ایک کے قریب وقت تھا، کہ بھوک خاصی تیز ہوگئی۔ مہمان خانے میں تنہا لیٹا ہوا تھا، کہ عین اس وقت مولانا کے خادم خاص میاں سلیمان (حضرت کے دو خادمِ خاص تھے ایک زنانی ڈیوڑھی پر رہتے تھے) ایک بڑی پلیٹ میں دو بڑے قلمی آم اور کئی تخمی مع چاقو وخوان پوش کے پہنچے اور یہ پیام دیا، کہ ''بعض دفعہ بھوک اُس وقت نہیں ہوتی لیکن کچھ وقت کے بعد پیدا ہو جاتی ہے مجھ سے فرمایا ہے کہ سامان جا کر ان کے پاس رکھ دینا۔ اور رکھ کر چلے آنا جی چاہے گا تو بے تکلف کھالیں گے۔ کسی کے سامنے بے تکلفی نہیں ہوتی ہے''۔ حکیم الامت کی یہ تشخیص اپنے ہر ہر جزئیہ کے لحاظ سے حکیمانہ تھی۔ بھوک واقعی اتنی دیر میں لگ آئی تھی۔

اور کسی اور کی موجودگی بھی ایک حد تک مخل ہو رہی تھی۔ یہ ایک ہلکا سا نمونہ پیش کر دیا گیا۔ دن رات نہ معلوم کتنی ایسی چیزیں پیش آتی رہتی تھیں۔ ہر چیز حضرت کی حکمت اور دقیقہ رسی کی مظہر ہی ہوتی۔

سیاسی مسائل میں حضرت کا مسلک بزرگانِ دیوبند کی اکثریت سے الگ، انگریزی حکومت سے مصالحت و مفاہمت، اور ایک قسم کی موالات ہی کا تھا۔ (اور یاد کر لیجیے، کہ حضرت کی وفات انگریزوں ہی کے دور میں ہوئی تھی۔ آزادی سے کوئی چار ساڑھے چار سال قبل) حضرت ہر مسئلے کی تائید میں شرعی دلائل رکھتے تھے۔ اور دیوبند والوں کا پورا احترام بھی کرتے تھے۔ اخبارات نہ زیادہ پڑھتے تھے نہ اس کی فرصت ہی رکھتے اور نہ سیاسی حالات سے نہ ہندوستان ہی کے زیادہ باخبر تھے۔ اور نہ بیرونی ملکوں کے، بس ایک آدھ ہفتہ وار پرچہ کوئی بھیج دیتا تھا اور اس کے پڑھنے پر قانع رہتے اور ایسی دینی تحریکوں کی پُر زور تائید کرتے رہتے جس سے امت کی کچھ بھی فلاح و بہبود کی امید تھی۔ مسلمانوں کی دینی ''ریفارم'' یا ''اصلاح'' کی تو نہیں دنیوی خیر و فلاح کے بڑی درد مندی کے ساتھ بڑے قائل تھے۔

اولاد دونوں محلوں سے کوئی نہ تھی۔ ایک چھوٹے بھائی شیخ اکبر علی مرحوم منیجر کورٹ آف وارڈس کے تھے۔ ان کے لڑکے مولوی شبیر علی کو مثل اولاد ہی چاہتے تھے۔ اور وہی کتابوں کی اشاعت کے اور خانقاہ وغیرہ کے منیجر بھی تھے۔ حضرت کے والد ماجد نے جائیداد خاصی چھوڑی تھی۔ ترکہ میں سے کچھ نہ لیا۔ ساری جائیداد بھائیوں ہی کی طرف منتقل کر دی۔ اور گویا جائیدادی جھگڑوں کی جڑ ہی کاٹ دی تھی۔ چھوٹے بڑے ہر معاملے میں رویہ صلح و آشتی ہی کا رکھتے تھے۔ اور اس میں پیش قدمی بھی خود ہی کرتے رہتے۔ مخالفت ذاتی، خانگی معاملات میں گویا کسی سے تھی ہی نہیں۔

سیاسی و مذہبی اختلافات میں لوگ علی العموم حد سے آگے نکل نکل گئے۔ اور سب و شتم میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ لیکن حضرت نے اپنے قلم سے جوابی تکفیر بھی نہ کی۔ کتابیں ہزاروں کی نہیں لاکھوں کی تعداد میں بکیں۔ کوئی دوسرا ہوتا تو لکھ پتی ہو جاتا۔ یہاں کاپی رائٹ تک قبول نہ کیا۔ کسی زمانے میں بعض کمپنیوں میں حصہ لیا تھا، بس اس پر آخر تک گزارا رہا۔

معتقدوں میں اچھے خاصے رئیس و اہلِ ثروت موجود تھے۔ لیکن نذرانہ بس خصوصی مخلصوں ہی سے قبول فرماتے اور ان کے لیے بھی حدود مقرر تھے۔ موروثی مکان کے علاوہ ایک مکان اپنے ذاتی پیسے

سے بنوایا۔ وہ مکان تعمیری حیثیت سے بھی دیکھنے کے قابل تھا۔ یعنی مختصر ہونے کے باوجود مکان اتنی سہولتوں اور بشری ضرورتوں کا جامع اور اتنا آرام دہ کوئی دوسرا مکان اس سے دگنا تگنا رقبہ رکھنے والا بھی مشکل ہی سے ہم پلہ ہوسکتا ہے۔ لیٹنے، بیٹھنے، نہانے، دھونے، کھانا پکانے اور کھانے، خلوت وجلوت سب ہی رعایتیں ہر موسم کی مناسبت سے اس میں موجود۔ کیا کسی انجینئر کا دماغ ان باریکیوں تک پہنچ سکتا، توازن اور حکمت حضرت کے ریشے ریشے میں بسی ہوئی تھی۔ زندگی کے ہر شعبے اور صنف میں نمایاں تھی۔

علومِ دینِ ظاہری میں جو پایا تھا خصوصاً تفسیر میں، اس کی نظیر بھی ہر دور میں آسانی سے نہیں مل سکتی۔ تفسیر اس قابل ہے، کہ اس کی بھی شرحیں اور حاشیے لکھے جاتے۔ اور کم سے کم اس کے، وقت اشاعت تک تو بے نظیر ہی سمجھا جاتا، تفسیر تو خیر تفسیر ہے ترجمۂ قرآن تک زبان سلاست کے پہلو سے بھی اپنا نظیر نہیں رکھتا۔

جہاں تک علومِ باطنی کا تعلق ہے یعنی اسلامی سلوک (معرفت اور روحانیت تصوف سے الگ) اصلاحِ نفس کا تعلق ہے۔ ان شاء اللہ اس دعوے کی لاج اللہ رکھ لے گا، کہ تاریخِ اُمت میں کوئی ہستی، مرشد، مربی و مصلح ان سے برتر نظر نہیں آتی۔ غزالی کا مرتبہ بے شک بہت بلند ہے، بلکہ یہ کہنے دیجیے، کہ امام تھانوی کے زمانے سے قبل انہیں کا مرتبہ بلند ترین ہے۔ لیکن تربیت السالک وغیرہ میں جیسی گتھیاں سلجھ کر آگئیں ہیں۔ ان کے بعد امام تھانوی کا پلہ کچھ بھاری ہی نظر آئے گا۔

''حکیم الامت'' جس کسی نے ان کا لقب اوّل بار رکھا وہ بجائے خود بھی ایک حکیم اور عارف اور ترجمانِ حقیقت تھا۔

(معاصرین، ص، ۱۵۔۲۱)

☆☆☆

تقریرِ تعزیت

بالآخر ہندی مسلمانوں کے دین کا، ایمان کا، علم کا، اخلاص کا، صلابت فہم، اصابت رائے کا، جو آخری نمونہ تھا، آہ کہ وہ ہم سے جدا کرلیا گیا۔

ایتہا النفس اجملی جزعا

فانک ماتخذ رین قدد قعا

واقعۂ ناگزیر پیش آ ہی گیا اگر چہ دل میں حیدرآباد سے یہ خیال لے کر دیوبند گیا تھا، کہ مجلسِ شوریٰ سے فارغ ہونے کے بعد ہندوستان کے چودھویں صدی کے ''پیر مجذوبؒ'' کے قدموں کو چومنے کا شرف حاصل کروں گا لیکن دہلی پہنچنے کے بعد معلوم ہوا، کہ ایمانیوں کا وہ ''محبوب'' تقریباً ایک ہفتے سے ''محبوبِ اعظم'' میں مستغرق ہے۔ نواب عبدالباسط خان صاحب (سابق صوبہ دارالحکومت آصفیہ ناظم عطیات) جو وظیفۂ حسنِ خدمت پا رہے ہیں اور مجلسِ شوریٰ دارالعلوم کے رکن ہیں وہ ہم سے پہلے دلی پہنچے تھے۔ اور دلی سے وہ سیدھے تھانہ بھون تشریف لے گئے تھے۔ ان ہی سے تفصیلاً معلوم ہوا تھا، کہ حضرت والا پر استغراق کی حالت طاری ہے۔ نواب صاحب نے کسی نہ کسی طرح جمالِ جہاں آراء سے سعادت اندوزی کا آخری موقع حاصل کرلیا تھا فرماتے تھے، کہ گاؤ تکیے سے لگے ہوئے دونوں ہاتھ باندھے ٹیک لگائے، آنکھیں بند کیے ہوئے پلنگ پر تشریف فرما تھے۔ سامنے ایک کرسی پر نواب صاحب بیٹھ گئے۔ ہند آنکھ والے قدسی چہرے پر نواب صاحب کی آنکھیں جمی ہوئی تھیں، کہ اچانک بند آنکھیں کھل گئیں۔ اور جیسے سمجھا جاتا، کہ بے ہوشی کی حالت میں ہیں، مولوی عبدالباسط خاں کی طرف مخاطب کر کے، اخاہ! نواب صاحب کب تشریف لانا ہوا خیر وعافیت تو ہے۔ جواب میں صرف یہ کہہ سکے، کہ بحمد للہ اچھا ہوں۔ حضرت کی قدم بوسی کو آ گیا تھا، کہ پھر وارفتگی کا جھونکا آیا کھلی آنکھ پھر بند ہوگئی۔ چند منٹ گزرے تھے، کہ پھر چمک اُٹھی اور اب کی وہ کہتے تھے، کہ دیر تک دارالعلوم دیوبند اور اس کے نصب العین، طریقۂ عمل، موجودہ حالت کی تفصیلات کے ساتھ حالیہ پیچیدگیوں کے سلجھانے کے متعلق حضرت

والا نے جو کوشش فرمائی تھی وہ سب بیان فرمائیں۔ کامل بیداریِ دماغ کے ساتھ معاملہ کے ایک ایک پہلو پر گفتگو فرمائی۔ مہتمم صاحب دارالعلوم مفتی مولانا محمد طیب صاحب جو حضرت والا کے مسترشدین میں ہیں ان کے نام پیغام دیا۔ بیچ میں بعضوں کی طرف سے اس مسئلے کے متعلق کچھ سوال، جواب کا سلسلہ بھی چھڑا۔ تشفی بخش وہی اپنے خاص بااصول الاشرف طریقے سے اس کا جواب عنایت فرمایا گیا۔ اور پھر آنکھیں بند ہوگئیں۔ مولوی عبدالباسط خاں صاحب اٹھ کر چلے آئے۔ دلی میں مجھ سے یہ حالات بیان کیے۔ اسی وقت خطرہ ہوا، کہ خطرہ کی گھنٹی بج رہی ہے۔ تاہم بلاوجہ مجھ میں امید پیدا ہوگئی، کہ آخری دیدار سے شاید محروم نہ ہوسکوں گا۔ اسی امید کو لے کر دیوبند پہنچا، رات کو پہنچا تھا۔ یہ ۱۶/ رجب مطابق ۲۰/ جولائی کی شب تھی۔ کل مجلسِ شوریٰ کا جلسہ ہونے والا تھا دارالعلوم کے مہمان خانے میں ٹھہرا گیا تھا تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہی خیال، کہ مجلس ختم ہو اور آخری دیدار کی تمنا پوری ہو۔ سامنے آتا اور نکل جاتا تھا تین بجے رات کو آنکھ کھلی، وہی خیال مسلط تھا۔ اب وہم تھا یا کیا تھا کچھ کافور کی خوشبو ناک میں آئی۔ خوشبو کے ساتھ ہی بلاوجہ خطرہ آیا، کہ کیا واقعہ پیش آگیا ہے؟ بہ مشکل اس خطرے کو ٹالا، اور پھر سو گیا۔ صبح ہوئی آٹھ بجے دارالعلوم میں اراکین جمع ہونے لگے۔ فقیر بھی حاضر ہوا چند اراکین کا انتظار ہو رہا تھا۔ ایک کتاب کی ضرورت تھی انتظار کے وقت کو غنیمت خیال کر کے کتب خانہ اسی جستجو میں چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپسی ہوئی، لیکن اراکینِ شوریٰ پر سکوت کا عالم طاری تھا، کیا ہوا؟۔ حضرت تھانوی جی کا انتقال ہوگیا۔

بجلی کی طرح یہ خبر کانوں سے گزرتی ہوئی دماغ اور دل پر ٹوٹی، مبہوت ہو کر بیٹھ گیا۔ میری امید کی دیوار بیٹھ گئی۔ رات کا خطرہ خطرہ ہی نہیں تھا واقعہ کا احساس تھا۔ جلسہ ملتوی کیا جائے، مدرسہ کا کاروبار بند کیا جائے۔ ہر طرف سے یہی تحریک ہونے لگی۔ میں اپنے خیال میں غرق، کہ کیا سوچ رہا تھا اور کیا ہوگیا، آخر جلسہ ملتوی ہوا۔ مہتمم صاحب دارالعلوم مولانا طیب صاحب نے فرمایا، چلیے! نودرہ چلیے، وہیں قرآن خوانی اور کلمہ خوانی ہوگی۔ اور مجھ سے فرمایا آخر میں ایک تعزیتی تقریر تجھی کو کرنی ہوگی۔ مجھ سے نہ بن پڑے گی۔ میں نے عرض کیا۔ لیکن احباب نے مجبور کیا۔ نودرے کا ہال طلبہ واساتذہ ومتعلقین دارالعلوم سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، لم ودی کدوی النحل کا سماں طاری تھا۔..... ہی میں ہم سب شریک ہوگئے شاید گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ وقت تنہائی میں گزرا، گنا تو نہیں گیا لیکن بیسیوں ختم شاید ہوگئے ہوں، اب سب جمع

ہو گئے۔ مولانا طیب صاحب نے کھڑے ہو کر حضرت والا کی وفات کا اعلان فرمایا، بھرائی ہوئی آواز میں مجھے اشارہ کیا، حاضر ہو گیا۔ اور وہی قرآن کی عجیب و غریب آیت جس نے، خدا ہی جانتا ہے تیرہ سو سال کے اس طویل عرصے میں مسلمانوں کے نازک وقتوں میں ان کے ٹوٹے ہوئے دلوں کو کتنی دفعہ جوڑا ہے، خاکسار نے تلاوت کی۔ یعنی:

وما محمد الارسول. قد خلت من قبله الرسول. افائن مات اوقتل نقلبتم علىٰ اعقابكم. ومن ينقلب علىٰ عقبيه فلن يضر الله شيئا. وسنجزى الله الشاكرين (١٤٣) وما كان لنفس ان تموت الا باذن الله كتابا مؤجلا. ومن يرد ثواب الدّنيانوته منها. ومن يرد ثواب الآخرة نوته منها. وسنجزى الشاكرين (١٤٥) (آلِ عمران)

ترجمہ "اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نرے رسول ہی تو ہیں، آپ سے پہلے اور بھی بہت رسول گزر چکے ہیں۔ سو اگر آپ کا انتقال ہو جائے، یا آپ شہید ہی ہو جائیں تو کیا تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے اور جو شخص الٹا پھر جائے گا تو خدا تعالیٰ کا کوئی نقصان نہ کرے گا۔ اور خدا تعالیٰ جلدی ہی عوض دے گا۔ حق شناس لوگوں کو (۱۴۴) اور کسی شخص کو موت آنا ممکن نہیں بدون حکمِ خدا کے، اس طور سے کہ اس کی معیادِ معین لکھی ہوئی رہتی ہے۔ اور جو شخص دنیاوی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو اس (دنیا) کا حصہ دے دیتے ہیں، اور جو شخص اخروی نتیجہ چاہتا ہے تو ہم اس کو اس آخرت کا حصہ دیں گے اور ہم بہت جلد عوض دیں گے، حق شناسوں کو (۱۴۵) (سورۃ آلِ عمران۔ ترجمہ: بیان القرآن از: تھانوی)

خطاب علماء سے تھا، ترجمہ کی حاجت نہ تھی، ابتدا کے چند فقرے غیر مخلوط عام آواز میں نکلے لیکن زیادہ ضبط ممکن نہ تھا۔ منہ سے الفاظ، آنکھوں سے آنسو، الفاظ بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے تھے جن میں دل غرق تھا۔

یتیم ہو گیا انسانوں کا وہ طبقہ یتیم ہو گیا جس کے اجسام اگرچہ اپنے باپوں سے پیدا ہوئے تھے لیکن جن کی روحوں نے ایمان کا نور اس نورِ اعظم کے نور سے حاصل کیا تھا۔ وہی جس کی روشنی مردوں میں بھی پھیلی اور عورتوں میں بھی، عوام میں بھی خواص میں بھی۔ اس کے بہشتی زیور نے اسلامی خواتین کو اگر سنوارا تو تفسیرِ قرآن اور کلیدِ مثنوی اور التکشف اور عبدیت کے دعوات نے مردوں کو جگایا۔ جس کے

قلم نے، زبان نے تقریباً ساٹھ ستر سال تک زمینِ ہند کے ایمانی دائروں کو جگمگائے رکھا۔ چھوٹی سے بڑی کتابوں تک جس کی تصنیفات کی تعداد غالباً ہزار کے قریب پہنچتی ہے۔ اردو زبان سے متجاوز ہو کر جس کے افادات طیبہ نے سندھی، گجراتی، بنگالی، زبانوں تک کا لباس خود اسی کی زندگی میں اختیار کیا۔ پس گویہ مصیبت مسلمانانِ ہند کی عام مصیبت ہے، لیکن اے دارالعلوم دیوبند کے طالب علمو! تمہارا اور ہمارا باپ، بلکہ باپ سے بھی جو زیادہ بلند رتبہ رکھتا تھا آج اس کا سایہ ہمارے سروں سے ہٹ گیا ہے۔ یقیناً روئیں گے ہم جس قدر رو سکتے ہیں۔ لیکن یہ تو فطرت کا ایک اضطراری اقتضا ہوگا۔ پس ہمیں ایسے وقت میں بھی عقل اور ایمان کے سررشتہ کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ ابھی یہ آیت تلاوت کی گئی، یہ محکم و قطعی نص کی شکل میں فیصلہ ہے، کہ اذنِ اللہ اور فرمانِ رب سے گزرنے کے بعد اس عالم میں موت کا ظہور ہوتا ہے۔ یعنی رحم سے جو بھرا ہوا ہے، حکمت سے جو معمور ہے، اس کے علم و ارادے سے گزر کر موت کا حکم واقعہ کی شکل اختیار کرتا ہے اور ایسی چیز قطعاً بے جا نہیں ہے بلکہ بجا ہی ہو سکتی ہے۔ اور آگے ''کتابا موجلا'' اس عام غلط محاورے کی تغلیط ہے جس میں لوگوں کی موت کو ناوقت کی موت، بے وقت کی موت قرار دینے والے قرار دیتے ہیں۔ کتاب ہے، فرشتہ ہے، مقرر ہے، موجل ہے وقت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے، ہم میں سے ہر فرد کی موت۔ پس یہ تو سوچنے کی بات ہی نہیں ہے، کہ جن کا وقت پورا ہو گیا سو وہ کیوں پورا ہوا۔ اس لیے پورا ہوا کہ وہ پورا ہو چکا تھا۔ سراسر رحمت و حکمت کے اذن سے پورا ہوا۔ تسلی کے لیے اور کیا چاہیے۔ البتہ سوچنے کی بات یہ ہے، کہ اس سے پہلے ہی صبر کا وقت ہے۔ لیکن کہا جاتا ہے ''سنجزی الشاکرین'' شکر کا مطالبہ ہو رہا ہے، ہی مقام محلِ نظر ہے۔ میں کہتا ہوں، کہ یہی مدرسہ تھا یہی دارالعلوم، اس کے یہی در و دیوار، آج سے ستر پچھتر سال پہلے اسی مدرسے میں داخل ہوا۔ اسی قسم کا جیسے تم میں ہر ایک مدرسے میں ایک طالبِ علم داخل ہوا۔ اور نہ وہ کوئی جن نہ تھا نہ جن زادہ، نہ فرشتہ نہ فرشتہ زادہ۔ آدمی، اسی قسم کا آدمی جیسے تم آدمی ہو۔ وہ اسی مدرسے میں آیا جس میں تم آئے ہو۔ اسی میں رہا اسی طرح رہا جیسے تم رہتے ہو۔ اس نے رہنے سے فائدہ اٹھایا۔ کچھ لے کر نہیں آیا تھا لیکن جب وہ باہر ہوا تو اس میں ایک قوت بھر گئی۔ ایسی قوت کہ دس دس بیس بیس ہزار کے مجمعوں کو تنہا ہمہ گوش بنا کر وہ اپنے اردگرد گھنٹوں بٹھائے رکھتا۔ اسی دارالعلوم سے حاصل کی ہوئی قوت نے اس کی انگلیوں

سے وہ چیزیں لکھوائیں جنہیں بلا مبالغہ کروڑوں نے اگر نہیں تو لاکھوں نے پڑھا۔ پڑھا ہی نہیں بلکہ ان پڑھنے والوں میں خدا ہی ان نفوس کے اعداد وشمار سے واقف ہے۔ جو ٹیڑھی راہوں سے ہٹ کر سیدھی راہوں پر لگ گئے۔ شیطان کے تابع تھے رحمان کے طالب بن گئے۔ جہنم کی طرف بھاگے جا رہے تھے جنت کی طرف ان کا رُخ ہو گیا۔ یہ ہے وہ نقشِ قدم، جو جانے والا آپ کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ پس اے دارلعلوم میں داخل ہونے والے طلبہ! جو اسی طرح اس مدرسے میں داخل ہوئے ہو جس طرح وہ ہوا تھا۔ یہی اس کا نقشِ قدم ہے۔ شکر کے یہی معنیٰ ہیں، کہ جس طرح جانے والے نے اپنی توانائیوں کے ہر ہر قطرے سے خود نفع اٹھایا اور دوسروں کو نفع پہنچایا، تم بھی اس کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرو۔ خدا کی دی ہوئی نعمتوں سے، ان قوتوں سے جو تمہارے اندر باہر بھری گئی ہیں نفع اٹھاؤ، ایسا کرو گے تو حق تعالیٰ کا وعدہ ''سنجزی الشاکرین'' کا ہے۔ اور اس نقشِ قدم کو چھوڑ کر اگر تم اپنی ایڑیوں پر واپس ہو جاؤ گے تو ''فلن یضر الله شیئا'' خدا کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ و آخر دعونا ان الحمد لله رب العالمین ربنا اغفرلنا ولاخواننا الّذین سبقونا بالایمان''۔

ضمیمہ :اس عرصے میں چند واقعات جو معلوم ہوئے ان کا ذکر بھی نامناسب نہ ہوگا۔

(۱) سنے میں آیا ہے، کہ روانگی کے دن صبح سے بار بار دریافت فرماتے رہے کہ آج کون دن ہے؟ جواب: دوشنبہ (پیر) کا دن ہے۔ پھر پوچھتے کون دن ہے؟۔ دوشنبہ (پیر) کا دن ہے۔ اللہ! اس مسرت کا اندازہ کون کرے جسے جانے کا وہی دن ملے جس دن میں سب سے بڑے جانے والے دنیا سے تشریف لے گئے۔ ظہر سے پہلے سنا گیا، کہ استغراقی کیفیت کا اانجلاء ہوا۔ الحمدللہ معاملہ صاف ہو گیا۔ یہ بشارت سنائی گئی۔ عصر کے بعد امانتوں کے صندوق کا مطالبہ ہوا۔ عورتوں نے عرض کیا، کمزوری ہے پھر دیکھ لیجیے گا، لیکن اصرار بڑھ گیا۔ آخر میں فرمایا ''ہم تو جا رہے ہیں''۔ لوگ کانپ گئے۔ صندوقِ امانت لا کر رکھ دیا گیا۔ ''ان توتو والا مانات الیٰ اھلونا'' کا فرض ادا کیا گیا۔ مغرب سے کچھ پہلے کہا ''دیکھیے! بعد مغرب ہم کہاں رہتے ہیں''۔ اور دس گیارہ کے درمیان آخر زندگی کی وہ گھڑی آ گئی جس کے لیے چوراسی سال سے جی رہے تھے۔ فرحمۃ اللہ علیہ، غسل کے وقت جن صاحب کو مشاہدے کا موقع میسر آیا وہ کہتے تھے ''مسکراہٹ چہرے پر کھل رہی تھی''۔

ضمیمہ :دارالعلوم میں جس وقت خبر آئی، ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ''کیا پہنچنے کی کوئی صورت ممکن ہے''۔ ہر ایک کی زبان پر یہی ایک سوال تھا۔ لیکن ساری راہیں مسدود نظر آئیں۔ پھر بھی چالیس پچاس طلبہ یوں ہی برستے ہوئے پانی میں کیچڑ، سیلاب ہر چیز کی پروا کیے بغیر پاپیادہ، تھانہ بھون روانہ ہو گئے۔ مغرب کے وقت پہنچے جنازہ میں شرکت کی آرزو اگرچہ پوری نہ ہوئی لیکن انما العمال بالنیات سے حاضری کی سعادت تو حاصل ہوگئی۔ بعد کو معلوم ہوا، کہ سہارن پور سے ایک اسپیشل ٹرین اور شاملی سے دوسری اسپیشل صلوٰۃ الجنازہ میں شریک ہونے کی تمنا رکھنے والوں کو لے کر روانہ ہوئی۔ ثانی الذکر بحمد اللہ ارادے میں کامیاب ہوئے لیکن سہارن پور والے بعد از وقت پہنچے، بارش ہو رہی تھی پھر بھی جا رہے تھے پانچ ہزار تک نمازِ جنازہ پڑھنے والوں کی تعداد کا لوگوں نے تخمینہ کیا۔

مولانا! میں حیران ہوں، دارالعلوم چھوٹے ہوئے تقریباً پچیس چھبیس سال ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں الگ ہوا تھا۔ برسوں کے بعد حاضری میسر آئی تھی۔ لیکن حیران ہوں خدا کی اس شان پر جو دور اور اتنا دور تھا خود حضرت والا کی خدمت گرامی میں میری حاضری وہ بھی ایک یا دو دن کے لیے زندگی بھر میں تین چار ہفتے سے زیادہ مشکل ہی سے ہوئی ہوگی۔ لیکن اس غائب کو دارالعلوم میں اس وقت حاضر ہونے کا موقع کیسے مل گیا گویا نہ جنازہ میں شرکت میسر آئی نہ اس سے پہلے دیدار کا موقع نصیب ہوا۔ لیکن جس مدرسے میں داخل ہونے کے بعد کا تو موقع نمل گیا۔ مجھ ایسے کوتاہ بختوں کے لیے یہ بھی خوش بختی ہے۔ فالحمد اللہ علیٰ ذالک۔

آخری وقتوں کا حال دیکھا کرے کوئی
کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی

(''صدق''، لکھنؤ۔ اگست ۱۹۴۳ء)

☆☆☆

مولانا تھانوی کی اعتدال پسندی

افرط وتفریط سے ہٹ کر زندگی کے جس مسئلے پر اور جس شعبے میں بھی آپ اعتدالی روش اختیار کریں گے تو اچانک معلوم ہوگا، کہ آپ تنہا رہ گئے ہیں، اور آپ کے ساتھ کوئی باقی نہ رہا، وجہ اس کی ظاہر ہے، کہ اکثریت عموماً لفظِ اعتدال سے ہٹ کر انحرافی زندگی بسر کر رہی ہے۔ ایسی صورت میں ''اعتدال'' پر قائم رہنے والوں کے ساتھ کوئی نہ ہو، یا ہوں تو تھوڑے بہت آدمی ہوں، یہ تعجب کی بات نہ ہوگی۔ آج کتنے ہیں جو حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ سے عقیدت رکھتے ہیں لیکن مولانا کی طبیعت کا جو رنگ تھا ذیل کی چند مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

ضابطہ وقوانین کی پابندی نہ، کہ اپنی مجبوری بلکہ دوسروں کی سہولت کے لیے

ا.....عام طور پر سمجھا جاتا ہے، کہ مولانا ضوابط وقوانین کی پابندی سختی کے ساتھ کرتے تھے۔ جن لوگوں کے مزاج میں سختی ہے اپنی سختیوں میں ہمیشہ وہ مولانا کے اسی اصول سے تسلی حاصل کرتے ہیں خیال یہ کر لیا گیا ہے، کہ رورعایت کا مولانا کی فطرت میں کوئی عنصر نہ تھا، مگر یہ تو لوگوں نے سمجھا ہے خود مولانا کا حال یہ تھا، کہ آپ کی مجلس مبارک میں کبھی اِدھر اُدھر کی خبروں کا ذکر لوگ چھیڑ دیتے، بعض سختی پسندوں نے عرض کیا، کہ ''حضرت کی مجلس میں اس قسم کی چیزوں کا تذکرہ کچھ مناسب نہیں معلوم ہوتا''۔ یہ بھی کہا، کہ ''بعضوں کو اس پر اعتراض بھی ہے، کہ مشائخ صوفیہ کی مجلس میں حقائق ومعارف کے سوا اِدھر اُدھر کی عام خبروں کا ذکر واذکار اچھا نہیں معلوم ہوتا''۔

مولانا نے فرمایا ''کوئی میرے پاس آکر بات کرے اور میں منہ موڑ لوں تو اس کو صدمہ ہوگا''

پھر اپنی معتدل فطرت کے فطری مذاق کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا:

''زائد از کار باتوں کی برائی میرے نزدیک دل شکنی سے کم ہے''۔ (کمالاتِ اشرفیہ۔ص ۳۷۱)

یہ آخری الفاظ مولانا تھانوی کے ہو سکتے ہیں؟ میں خیال کرتا ہوں، کہ اُن کو قریب سے دیکھنے والے بھی تھوڑی دیر کے لیے سوچ میں پڑ جائیں گے۔ مگر کیا کیجیے کہ یہی واقعہ ہے۔ لوگ اس کا خیال

نہیں کرتے، کہ خود اعدل خلق اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل اس باب میں کیا تھا۔ معمولی بڑھیا ہاتھ پکڑ کر دیر تک اپنی غیر ضروری باتوں میں مشغول رکھتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم سنتے رہتے ہیں، کیا صحیح حدیثوں میں یہ نہیں آیا ہے؟۔

مولانا ہی فرمایا کرتے تھے، کہ ''حضرت مولانا محمد قاسم رحمۃ اللہ علیہ کا بھی مذاق تھا، کہ ملنے والے جب تک بیٹھے رہتے، ان سے گفتگو کرتے رہتے، مقصود یہی تھا، کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو بے رُخی کا احساس دلوں میں پیدا ہوتا ہے۔ جو عموماً موجب دل شکنی بن جاتا ہے۔ مجلسِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت صحابہ کرام کیا بیان کرتے تھے ''بضحات مما یضحکون ویتعجب مما یتعجبون''۔ ''لوگ جن باتوں پر ہنستے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان پر ہنستے، جن باتوں پر لوگ تعجب کرتے آپ بھی تعجب فرماتے''۔

دل شکنی کا خیال یہاں تک تھا، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مصافحہ کرنے والے کا ہاتھ خود نہیں چھوڑتے تھے، جب تک، کہ وہی نہ چھوڑ دیتا۔ کسی سے رخ نہ پھیرتے تھے۔ جب تک وہی نہ پھیر لیتا۔ خود حکیم الامت قدس سرہ اپنا ایک خواب بیان فرماتے تھے، کہ ''ملکہ وکٹوریہ جس زمانے میں زندہ تھی آپ نے خواب میں اس کو دیکھا ایک ایسی گاڑی پر جس میں نہ گھوڑے ہیں اور نہ باگ نظر آتی تھی۔ (موٹر کار اس وقت تک ایجاد نہیں ہوئی تھی) بہر حال خواب میں معلوم ہوا، کہ مولانا سے کہہ رہی ہے، کہ ''اسلام ہی حق مذہب مجھے معلوم ہوتا ہے، البتہ ایک شبہ مجھے ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اسلام مذاق لوگوں سے کیوں کرتے تھے، نبوت تو بڑی چیز ہے عام تہذیب میں بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا جاتا''۔ خواب ہی میں حضرت فرماتے ہیں، کہ ''میں نے ملکہ سے کہا، کہ لوگوں کو مانوس بنانا مقصود تھا ورنہ آپ کے رعب کی وجہ سے لوگ کھل کر دل کی باتیں نہیں کہہ سکتے تھے''۔ ملکہ اس جواب کو سن کر مطمئن ہوگئی۔ دیکھا آپ نے مولانا کی نظر کہاں پہنچی، بیداری میں نہیں خواب میں دماغ وہیں پہنچا تھا جہاں اس کو پہنچنا چاہیے۔

داڑھی سے متعلق مولانا کی معتدل رائے

۲.....عام طور پر مولانا کے جس مذاق کو لوگوں نے مشہور کیا ہے اس کے حساب سے آپ ہی بتایئے، کہ اس سوال کا جواب یعنی ''ایک داڑھی منڈانے والے کے ساتھ لڑکی کا رشتہ کروں یا نہ کروں''۔

ایک صاحب نے یہ لکھتے ہوئے سوال کیا، کہ داڑھی والے جو ملتے ہیں تو دال روٹی کا ان کے یہاں اطمینان نہیں اور جہاں اس کی تھوڑی بہت امید ہے وہاں خرابی یہ ہے، کہ داڑھی منڈانے والے لڑکے ملتے ہیں۔ مولانا کے مذاق شناسی کے مدعی خود سوچیں، کہ اس کا کیا جواب دیں گے۔ مگر سنیے مولانا نے کیا جواب دیا:

''میرا خیال ہے، کہ اس زمانے میں پوری دینداری داڑھی والوں میں بھی نہیں بس ایک داڑھی منڈانے کا گناہ کر رہا ہے دوسرا شہوت پرستی کا گناہ کر رہا ہے تو نری داڑھی لے کر کیا کریں گے''۔ (کمالات اشرفیہ۔ ص ۳۳۹)

حقیقت یہ ہے، کہ مولانا نے بڑے نکتے کی طرف اس میں اشارہ فرمایا ہے۔ لوگوں نے خاص خاص گناہوں کو پکڑ لیا ہے، گویا گناہ گار ہونے نہ ہونے کا معیار بس صرف وہی ہے، ان ہی گناہوں میں ایک داڑھی بھی ہے۔ ایک شخص غیبت کرتا ہے، بدنظر ہے، اور عملی طور پر بے احتیاط ہے، لیکن لمبی داڑھی رکھتا ہے، اس پر لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہوتا۔ اور ایک بے چارہ ان عیوب سے بری ہے صرف داڑھی منڈانے کا گناہ کرتا ہے تو سمجھا جاتا ہے، کہ داڑھی والے صاحب سے داڑھی منڈانے والے کو کیا نسبت۔ حالانکہ جیسے داڑھی منڈانا گناہ ہے داڑھی والوں کے گناہ اس سے کم نہیں۔ پھر ایک داڑھی پر اتنا زور کیوں دیا جاتا ہے۔ مولانا نے صحیح فرمایا ہے، کہ: داڑھی منڈانے کے سوا اور باتیں لڑکے میں اچھی ہوں تو اس کو گوارا کر لیا جائے۔ بلکہ اس برتاؤ سے اغلب ہے، کہ داڑھی کا مسئلہ بھی اس کی سمجھ میں آجائے گا۔ ورنہ جو طریقہ لوگوں نے داڑھی کے ساتھ اختیار کر رکھا ہے میں دیکھتا ہوں، کہ منڈانے والوں کی جراتوں کو اس طریقے نے اور بڑھا دیا ہے۔

جدید تعلیم یافتہ طبقے کی حوصلہ افزائی

۳.....مولانا چونکہ خود مولوی تھے، اس لیے مولویوں (ا) کا خیال ہوگا، کہ انگریزی تعلیم یافتوں پر ضرور مولویوں کو ترجیح دیتے ہوں گے۔ اور اس میں شک نہیں، کہ عربی خواں مولویوں کا مولانا خاص طور پر احترام فرمایا کرتے تھے۔ مگر ایک دفعہ آپ نے فرمایا، کہ:

انگریزی دانوں میں اور جتنی باتیں بھی ہوں لیکن ان کی گفتگو میں مزا آتا ہے۔ کیوں، کہ یہ سمجھ

میں آنے سے مان لیتے ہیں۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۳۹)

مولویوں کے اس طریقے کو، کہ جو بات منہ سے نکل گئی اس کی پچ کیے چلے جاتے ہیں سخت ناپسند فرماتے تھے۔ مولوی عبدالخالق صاحب کا فقرہ "اڑیل ٹٹو" اس قسم کے مولویوں کے متعلق فرمایا اور کہا کہ "جمود واصرار بری چیز ہے"۔ پھر حکمت کی بات یہ فرمائی، کہ "غلطی پر اصرار آدمی کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کر دیتا ہے لوگ اس شخص کی تعریف کرتے ہیں جو اپنی غلطیاں مان لیتا ہے"۔

غیر مسلموں کے ساتھ مولانا کا رویہ

۴.....انگریزی خواں بے چارے بھی تو مسلمان ہی ہوتے ہیں اسلامی گھرانے میں پیدا ہوتے ہیں۔ غیر مذہب کے لوگوں سے ملنے جلنے کا طریقہ کیا تھا اس قصے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے جب آپ اعظم گڑھ تشریف لے گئے تھے۔ راستے میں کسی اسکول کے سامنے سے گزر ہوا۔ جہاں زیادہ تر ہندو اساتذہ تھے۔ مولانا نے فرمایا، کہ "مجھے گزرتا دیکھ کر سارے ہندو اساتذہ اور طلباء بھی تعظیماً اٹھ کھڑے ہوئے"۔ اس حال کو دیکھ کر مولانا فرماتے ہیں، کہ "میں وہاں رُکا اور ان سب سے ملا لوگوں سے میں نے مصافحے کیے"۔ پھر خصوصیت کے ساتھ ارشاد ہوا، کہ:

"ایک ایک سے ملا، حتیٰ، کہ ہندوؤں سے بھی اور مزاج پرسی کی"۔ (کمالات اشرفیہ۔ ص ۳۷۷)

آپ کو معلوم ہے، کہ مولویوں کا عام قاعدہ ہے، کہ ایسے مدرسے کے سامنے سے جب گزرتے ہیں اور جیسے حضرت کے ساتھ مدرسے والوں نے برتاؤ کیا تھا اسی برتاؤ کے ساتھ پیش آتے ہیں تو عام طور پر مولوی لوگ ان ہندوؤں کی طرف متوجہ ہونا اپنی شان کے خلاف تصور کرتے ہیں۔ پھر حضرت نے اس تنگ دل ملّا کا ذکر کیا جس کے واعظ میں ایک غیر مذہب کا جو شاید ہندو ہی تھا شریک ہو گیا تھا، مجلسِ وعظ میں ہندو کو دیکھ کر ملّا صاحب آپے سے باہر ہو گئے، گرجنے لگے، کہ "نکالو! اس کافر مردود کو"۔ (کمالاتِ اشرفیہ، ص ۳۷۷)

مختلف فیہ مسائل میں مسلکِ اعتدال، مشروط رائے

بعض خاص نوعیت کے مسائل کے متعلق مشہور کر دیا گیا ہے، کہ دیوبند کی طرف سے منسوب ہونے والے علماء کا ان مسائل میں یہ خیال ہے، حتیٰ، کہ بے جانے بھی لوگ سمجھ جاتے ہیں، کہ دیوبندی

مولوی اس کا یہ جواب دے گا۔مثلا! یہ سوال، کہ ''یارسول اللہ'' کہنے کا مسلمانوں میں عام رواج پایا جاتا ہے، دیو بندی مولوی اس کو کبھی جائز نہیں کہہ سکتا۔مگر سنیئے! دیو بندیوں کے پیشوا کا کیا خیال تھا فرمایا، کہ:

''شوقا والتذاذاماذون فیہ'' (کمالاتِ اشرفیہ، صِ ۵)

یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کے قلوب کا جو اشتیاقی تعلق ہے، اس تعلق کا اظہار ''یارسول اللہ'' سے اگر کوئی کرتا ہو یا ''یارسول اللہ'' کہنے میں اس کو لذّت ملتی ہو تو مولانا اسی صورت میں ''یارسول اللہ'' کہنے کی اجازت دیتے تھے۔البتہ ''استغاثة'' و''استعانة'' فرمایا کہ جائز نہ ہوگا۔

ایسے سینکڑوں مسائل اور امور ہیں جن کے متعلق لوگوں کے عام خیالات اور توقعات کے قطعاً مخالف چیزیں مولانا کے کلام میں ملتی ہیں۔ضرورت ہے، کہ ان چیزوں کو نمایاں کیا جائے۔

غلط فہمیوں کے ازالے کے سوا خود مولانا کے عقیدت مندوں کے بہت سے غلط خیالات کی اس سلسلہ سے جہاں تک میں سمجھتا ہوں اصلاح ہو سکتی ہے، میرے پاس اس وقت مولانا کی کتابوں کا ذخیرہ نہیں، صرف کمالات اشرفیہ سے سرسری طور پر چند چیزوں کا ارتجالاً انتخاب کرلیا گیا ہے۔افسوس ہے، کہ مولانا کی زندگی کے بہت سے گوشے جب تک زندہ رہے غایت اخفا کی وجہ سے پوشیدہ رہے کچھ شک نہیں، کہ اس زمانے میں بھی بعض مصلحین نے اپنی قوموں سے چھوت چھات نسلی تفریق اور اخلاقی خرابیوں کو ختم کرنے کے لیے بڑی کوششیں اور ~~اس راہ~~ عمل میں بڑے مجاہدے کیے ہیں۔مگر اکثر ان لوگوں کے کلاموں میں نمود نمائش کا شائبہ پایا جاتا ہے، ان کی ہر چیز کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے، اس سے بھی گہری بات وہ ہے جس کی طرف امام غزالی علیہ الرحمۃ نے لباس کی بحث میں اشارہ کیا ہے، کہ نمائش صرف اچھے کپڑوں ہی کے پہننے میں نہین ہے۔بلکہ اس سے بھی بڑی ریاکاری یہ ہے، کہ پھٹے پرانے گوذڑ پیوند در پیوند لگے ہوئے کپڑے کے ساتھ اپنے آپ کو اتنا مقید کرلیا جائے، کہ جب تک وہ نہ ملیں کپڑے ہی نہ پہنیں گے۔اسی طرح یہ ضد کہ میں رہوں گا تو فلاں کے پاس اور ٹھہروں گا تو فلاں جگہ، مجھے اس میں بھی بجائے بڑائی کے کچھ اس قسم کی بات نظر آتی ہے جو عموماً چھوٹے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔آخر آپ اس شخص کو کیا کہیں گے جس نے التزام کرلیا، کہ کھاؤں گا تو جو ہی کی روٹی کھاؤں گا، قورمہ

اور پلاؤ پر اصرار کرنے والوں میں اور اس جو کی روٹی میں اپنی غذا کو منحصر کرنے والوں میں کیا فرق ہے۔

بھائی اکبر علی کا مشورہ اور مولانا کی عاجزی

خیر! دوسروں سے مجھے کیا بحث، میں تو مولانا کے متعلق عرض کر رہا تھا، کہ خود ہی فرماتے تھے، کہ:

''میرے بھائی اکبر علی نے مجھے ایک دن کہا، کہ اب تمہارا شمار ہندوستان کے بڑے آدمیوں میں ہے، اس لیے چاہیے، کہ سفر کم از کم سیکنڈ کلاس میں تو کیا کرو''۔ حضرت فرماتے ہیں، کہ ان کے اس مشورے کو سن کر میں نے عرض کیا، کہ ''کیا کروں، میری طبیعت کے خلاف ہے۔ میں ریل میں گنواروں اور بھنگی چماروں کے ساتھ بیٹھتا ہوں''۔ (کمالاتِ اشرفیہ ص ۳۷۵)

انسانی ہمدردی کی غیر معمولی مثال

اسی طرح آج عام انسانی ہمدردی کا دنیا میں کتنا چرچا ہے، لیکن مولانا نے خود اپنا قصہ جو بیان کیا ہے، کہ ''بھاولپور گیا ہوا تھا۔ گرمی سخت تھی۔ جیل خانے کے قیدیوں کو پنکھا کھینچنے کے لیے بلایا گیا''۔ مولانا فرماتے ہیں، کہ ''پہلے یہی بات مجھے ناگوار ہوئی اور چاہا، کہ ان کو واپس کر دوں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آیا، کہ جیل کی زندگی سے ان بے چاروں کو تھوڑی دیر کے لیے اس ذریعے سے تو رہائی مل جاتی ہے۔ یہ سوچ کر واپس کرنے کے خیال کو تو دل سے نکال دیا، انتظار کرتا رہا، جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے ان قیدیوں سے کہا، کہ ''پنکھا بند کر دو پھر جی چاہے سو رہو یا بیٹھے رہو کیونکہ بیگار لینا جائز نہیں''۔

فرمایا، کہ ''کھانا آیا تو ان قیدیوں کو بھی کھانا دلوایا، پھر تو ہر قیدی اسی کی خواہش کرتا، کہ میں بلایا جاؤں''۔

حاشیہ

(۱) یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ مولانا تھانوی کے یہاں ڈاڑھی کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اور قصرنیہ کے سلسلہ میں ان کا مسلک علماء کے خلاف تھا۔ مولانا کے اس مقولے کا مفہوم صرف یہ ہے، کہ عملی اور اخلاقی برائیاں صرف ڈاڑھی رکھ لینے سے بے اثر نہیں ہو جاتیں بلکہ ڈاڑھی رکھ کر اپنی صورت کو مطابق شریعت

بنایا گیا ہے تو اپنے قلب و دماغ سے منکراتِ شریعت کا میل کچیل نکال کر سیرت کی تزئین اور تہذیب بھی ضرور کرنی چاہیے.....قیصر۔

(دارالعلوم/ ماہنامہ دارالعلوم دیوبند کا ترجمان)

☆☆☆

تقریظ والانتقاد.....حکیم الامت

ع قبولِ خاطر ولطف سخن خداداد است

اس کی کتنی اچھی شہادت ہمارے زمانے میں سیدنا حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کی ذات بابرکات تھی ہی نہیں بلکہ اب بھی ہے۔ خدا ہی جانتا ہے، کہ حسنِ قبول کا یہ خداداد سلسلہ کب تک جاری رہے گا۔

حضرت کی زندگی کے آخری سالوں میں بات یہاں تک پہنچ گئی تھی، کہ زبانِ مبارک سے کوئی لفظ یا فقرہ مشکل ہی سے نکلا ہو، جسے لوگوں نے نوٹ نہ کیا ہو، اور نوٹ نہ کرنے کے بعد چھاپ کر شائع نہ کر دیا ہو، مرحوم غفرلہ خود فرمایا کرتے تھے، کہ:

''نادیدہ کراماً کاتبین کے ساتھ دیکھیے، میرے پیچھے دیدہ کاتبین لگا دیئے گئے ہیں''۔

وطناً جیسا، کہ معلوم ہے حضرت والا ایک قصباتی آدمی تھے، وہ بھی ضلع سہارن پور کے ایک قصبہ کے جو اردو زبان کے اضلاع مشدّدہ میں خاص شہرت رکھتا ہے، اور تعلیم بھی پائی، مدرسہ دیوبند (۱) بھی ایسے زمانے میں جب اردو زبان میں لکھنا پڑھنا علماء کے لیے موجبِ اہانت نہ تھا تو سرمایۂ مباہات بھی نہ تھا، علماء ایک خاص قسم کی زبان استعمال کرنے کے عادی تھے، جسے عوام نہ زیادہ سمجھ پاتے تھے اور نہ اس سے دلچسپی لیتے تھے۔

مگر باین ہمہ اسی مولویانہ زبان میں جس پر سہارن پوری لب ولہجے کا کافی اثر قدرتی طور پر تھا بغیر کسی تصنع اور بناوٹ کے حضرت تھانوی نے لکھنا بھی شروع کیا اور اسی زبان میں آپ کی تقریریں بھی ہونے لگیں، مجلسی گفتگو بھی آپ اسی طرزِ خاص کی مولویانہ زبان ہی میں فرماتے تھے اسی کے وہ عادی تھے لیکن خداداد حسن وقبول کے سوا اس کی توجیہ اور کیا کی جائے، کہ آپ کے قلم کا لکھا ہوا ایک ایک حرف، زبانِ مبارک سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ، کانوں سے گزر کر عموماً دلوں میں اترتا رہا۔ اپنے آپ کو اپنی زبان کو اپنے لکھنے اور بولنے کے طریقے کو حضرت نے تو نہیں بدلا لیکن دیکھا گیا، کہ بڑے

بڑے وقت کے منشی، قلم اور زبان کے دھنی خود اپنے آپ کو بدل رہے ہیں۔ اور کوشش کر کر کے اسی طرزِ خطاب واسلوبِ کلام سے اپنے آپ کو مانوس بنانے کی کوششوں میں منہمک ہیں جس کا سامنا بھی شاید وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے۔

بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے، کہ مطبوعہ شکل میں آج حضرت مولانا اشرف صاحب علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی تحریری وتقریری سرمایہ کا جو ذخیرہ اردو زبان میں پایا جاتا ہے شاید اس کی نظیر نہیں ہو سکتی۔ ادھر کچھ دنوں سے ایک طبقہ تیار ہو گیا ہے، جو حضرت حکیم الامت کے افادات کو مختلف پیرایوں میں مدون و مرتب کرنے میں مشغول ہے، اسی کو دین کی علم کی، انسانیت کی، خدمت یقین کرتے ہوئے کافی جوش اور ولولے سے اسے انجام دے رہا ہے، ''شکر اللہ مسایعھم وبارک فیھا''۔ افاداتِ شرعیہ کے خادموں میں علماء بھی ہیں، صاحبِ قلم مشاہیر اور تعلیم یافتہ انگریزی خواں جماعت کے افراد بھی ہیں۔ آئے دن نئے نئے عنوانوں سے اس سلسلے میں کتابیں پیش ہو رہی ہیں۔ لینے والے ہاتھوں ہاتھ ان کتابوں کو لے رہے ہیں پڑھ رہے ہیں۔ خود فائدہ اٹھا رہے ہیں دوسروں کو فائدہ پہنچا رہے ہیں۔

گزشتہ مہینے میں ایک نئی کتاب ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' کے نام سے اردو زبان کے کہنہ مشق صاحبِ طرز ادیب مولانا عبدالماجد دریا آبادی مدیر ''صدیق جدید'' کے قلم سے مرتب ہو کر شائع ہوئی ہے۔ کتاب خاکسار کے پاس بھی پہنچی۔ یہ واقعہ ہے، کہ ہاتھ میں لینے کے بعد اسی وقت الگ ہوئی جب ۶۱۴ صفحات کو ختم کر کے تڑپ رہا تھا، کہ آخر یہ کتاب کیوں ختم ہو گئی۔ یہ کتاب کیا ہے؟۔ اس میں دین کے لیے، علم کے لیے، عقل کے لیے، ذہن کے لیے، دل کے لیے، دماغ کے لیے، مصنف کے حسنِ مذاق نے کتنی لذیذ ذود ہضم غذائیں جمع کر دی ہیں اس کا صحیح اندازہ کتاب کے پڑھنے ہی سے ہو سکتا ہے لیکن ایک بات تو بالکل نمایاں اور کھلی ہوئی ہے، یعنی مکتوبات، ملفوظات، یا اسی نوعیت کی کتابیں جو عموماً حضرت صوفیہ کرام کے افادات کی عام شکلیں ہیں، اس کتاب کا رنگ ان سب سے الگ اور نرالا ہے، اگر چہ اس میں بھی حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کے کچھ ملفوضات بھی ہیں اور کچھ مکتوبات بھی لیکن جس شکل میں یہ چیزیں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں کم از کم خاکسار کا ذاتی تاثر تو یہی ہے، کہ تصنیفات وتالیفات کے دائرے میں شاید ایک مستقل صنف کا اضافہ اس کتاب کی شکل میں ہو گیا ہے۔

پڑھنے والے اس میں بے شمار اعتقادی الجھنوں سے نجات کی ضمانتیں بھی پائیں گے۔ بعض اہم فقہی مسائل کی تحقیق کا لطف بھی ان کو ملے گا۔ تصوف کے نکات واسرار کا یہ کتاب مستقل گنجینہ ہے۔ لیکن ان کے سوا بھی خانگی زندگی کی دشواریوں کے متعلق راحت بخش نیک مشورے آپ کو ملیں گے۔ وہیں وقت کے بعض سیاسی نظریات کے سلسلے میں آپ کے سامنے ایسے پہلو بھی اس کتاب میں آئیں گے جسے مانا جائے یا نہ مانا جائے، لیکن سیاسی تدبیر وفکر کا اسے غیر معمولی نمونہ سمجھا جاسکتا ہے۔ مجلسی ادب، ملنے جلنے کے ضوابط، لاضرر ولاضرار والی خوشگوار زندگی کے اصول وقوائد تو تھانوی افادات کی خصوصیات ہیں، الغرض کتاب کا ہر ورق بلکہ شاید ہر صفحہ کم از کم میرے لیے تو مستقل درس ہی بنتا چلا جاتا تھا۔ یہ کہہ سکتا ہوں، کہ آج پڑھنے والے اخباروں، رسالوں، موسمی کتابوں کے ہزار ہزار صفحات میں بھی جن چیزوں کو نہ پاتے ہیں اور نہ پاسکتے ہیں اس کتاب کا پڑھنے والا محسوس کرے گا، کہ اس کی ایک ایک سطر میں وہی چیزیں مسلسل ملتی چلی جاتی ہیں، کہ بے ساختہ مصنف کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ ''جزاہ اللہ عنا دعن امة محمد صلی اللہ علیہ وسلم خیر الجزاء''۔ باقی اپنی رائے یا تاثر کو بجائے تقریظ کے عصری تنقید کا مصداق بنانے کے لیے کتاب کی کوتاہیوں اور نقائص کا ذکر اس کے متعلق کیا عرض کروں۔ وہی امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ والی بات یاد آتی ہے ''الرسالة'' نامی تصنیف لکھنے کے بعد سترہ دفعہ بیان کیا جاتا ہے، کہ امام نے اس کتاب کی نظر ثانی کی، ہر دفعہ کافی نقائص سامنے آئے تھے۔ آخر سترہویں دفعہ نظر ثانی کے بعد فرمایا:

''خدا انکار کرتا ہے، کہ اس کی کتاب کے سوا کسی مخلوق کی کتاب نقائص سے پاک ہو''۔

امت کے ایک جلیل القدر امام مجتہد کا جب یہ تجربی اعتراف ہے تو اسی سے سمجھنا چاہیے، کہ کسی ناقص مخلوق کے ناقص کام کی تعریف کا مطلب یہ قطعاً نہیں ہوتا، کہ اس میں واقعی کوئی کوتاہی نہیں رہ گئی ہے، یا ایک عیب چینی کا ارادہ کیا جائے تو عیوب نہیں نکالے جاسکتے۔ دوسرے کے متعلق تو کیا کہوں خود بعض مواقع پر اس فقیر کا ذکر اس کتاب میں جس طریقے سے کیا گیا ہے پڑھ کر شرم سے گردن جھک گئی میرے ایک خط کا مضمون جو وقتی تاثر کا نتیجہ ہوگا شاید اب مجھے یاد بھی نہیں۔ بجنسہ مصنف نے نقل فرمادیا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے، کہ لوگ اس سے کیا کیا نتیجہ نکالیں گے۔ خانگی خطوط کی عام اشاعت لکھنے والے

کے امتزاج کے بغیر اسی لیے خاکسار کا خیال تو یہی ہے، کہ شاید مناسب بھی نہیں ہے لیکن ''.....اللہ فسوف یکون جف القلم بما ھو کائن''۔

حاشیہ

(۱) یعنی تشدید کے بغیر جو الفاظ عموماً اردو زبان میں بولے جاتے ہیں یوپی کے بالائی حصے کے چند اضلاع سہارن پور، مظفر نگر، بجنور وغیرہ میں ان ہی کو عوام تشدید کے ساتھ استعمال کرتے ہیں مثلاً روٹی کو رتّی کہتے ہیں۔ اگر چہ اب بتدریج یہ تشدیدی رنگ ہلکا پڑتا جارہا ہے جو مواصلات کی سہولتوں کا لازمی نتیجہ ہے۔

نوٹ

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کی کتاب ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' پر مولانا گیلانی کی تقریظ ہے جو، کہ معارف نمبر ۴ جلد ۷۰/ اکتوبر ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی (مرتب)

(معارف اعظم گڑھ۔ شمارہ ۴ جلد نمبر ۷۰/ اکتوبر ۱۹۵۲ء)

☆☆☆

ضمیمہ

تھانہ بھون کی وجہ تسمیہ

سرکار سہارنپور میں تھانہ کے نام سے دو پرگنے موسوم تھے۔ تمیز کے لیے ایک کو ''تھانہ بھیم'' اور دوسرے کو ''تھانہ بھون'' یا ''تھانہ بھیون'' کہتے تھے۔ آخیر زمانے میں حکیم الامت قدس سرہ کے قیام نے تو اسلامی مرکزوں میں سے ایک مستقل مرکز ''تھانہ بھون'' کو بھی بنا دیا۔ مگر حضرت والا سے پہلے بھی خود حضرت کے پیر و مرشد المہاجر الامام المکی نور اللہ ضریحہ اور حافظ ضامن شہید جیسی زندۂ جاوید ہستیاں تھانہ بھون کی سرزمیں مسلمانوں کو عطا کر چکی تھی۔

(سوانح قاسمی: جلد اوّل، ص ۴۹)

☆☆☆

سیدنا ابوذر غفاری.....پہلی کتاب

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے سیدنا ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سیرت طیبہ میں اس دعوے کو پیش کرتے ہوئے، کہ مسلمانوں کے مجاذیب و بہالیل طبقہ کے سرکردہ صحابہ کرام میں حضرت ابوذر غفار رضی اللہ عنہ کی ذاتِ مبارک نظر آتی ہے، فقیر نے مولانا محمد یعقوب صاحب کے بھی بعض واقعات و حالات کی طرف اسی موقع پر اشارہ کیا تھا۔ اس وقت تک حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے نہ خاکسار ہی کو نیاز حاصل کرنے کا موقع ملا تھا اور نہ مجھ جیسے ناپرسان طالب علم کے حال سے حضرت والا کے واقف ہونے کی کوئی صورت ہی تھی۔ لیکن تحریر کا یہی حصہ ''القاسم'' دارالعلوم کے مجلّہ میں جب شائع ہوا، اور حضرت تھانوی کی اس پر نظر پڑی تو اسی وقت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب مرحوم (سابق مہتمم دارالعلوم) کے نام ایک خط لکھا گیا، جس میں ایک مکتوب خاص فقیر کے نام بھی تھا۔ ''سید الکاتبین احسن اللہ مناظرہٗ'' کے خطاب سے مخاطب کرتے ہوئے شاباشی دی گئی اور ارقام فرمایا گیا تھا، کہ ''مضمون نگار اگر محقق ہو چکے ہیں تو یہ مضمون ان کی محققیت کی دلیل ہے، ورنہ ''محققیت متوقعہ'' کی امید تو

بہر حال ہے''۔ بہر حال حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب کی جذبی کیفیت کی بھی اس گرامی نامہ میں توثیق کی گئی تھی، اسی کتاب میں کسی موقع پر یہ بھی گزر چکا ہے، کہ سیدنا الامام الکبیر سے مولانا محمد یعقوب صاحب کے کسی قول کا ذکر کسی نے کیا تو تو آپ اُٹھ بیٹھے، اور فرمایا، کہ وہی ایسی باتیں کر سکتے ہیں ہم جیسوں کے تو فوراً کان پکڑ لیے جائیں۔ (اوکما قال) حضرت تھانوی نے ''براہ ناز'' سے ان کی لاہوتی زندگی کے اسی پہلو کی طرف شاید اشارہ فرمایا ہوگا۔ ہوسکتا ہے، کہ حضرت داؤد علیہ السلام نسماتی وجود کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کے سامنے غیب کے کسی عالم میں پیش ہوئے، تو ان کے غیر معمولی حسن سے متاثر ہو کر حضرت آدم علیہ السلام نے پوچھا، کہ یہ کون ہیں؟۔ اور عمر، ان کی کیا ہے؟۔ نام کے ساتھ بتایا گیا، کہ ساٹھ سال عمر ان کی ہوگی۔ حضرت آدم علیہ السلام نے فرمایا ''زده من عمری اربعین سنة ''یعنی ''اے پروردگار! میری عمر سے چالیس سال ان کو دے دیے جائیں''۔ یہ حدیث ترمذی وغیرہ کی ہے ممکن ہے، کہ مصنف امام (مولانا محمد یعقوب نانوتوی) کے سامنے کچھ اس قسم کی چیزیں ہوں۔

(سوانح قاسمی، جلد سوم۔ ص ۱۲۳۔۱۲۴)

☆☆☆

حضرت حاجی صاحب کی مقبول دعا

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی مدظلہ العالی کی تالیفات کی تعداد کمیتاً اور کیفیتاً کیا ان ہی نوادر کی زندہ توثیق اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

بحمد اللہ! ابھی اسلام کا یہ زندہ معجزہ ہم مسکینوں کے سر پر سایہ فگن ہے۔ وہ معنا اللہ بطول حیاتہ ۱۹۳۰ء یعنی آج سے بارہ سال پہلے مجلس مبارک میں کتابوں کا ذکر آیا۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی اپنے پیر کی دعا کا ذکر فرماتے ہوئے ارشاد ہوا تھا، کہ اس وقت تک پانچ سو انتیس کتابیں حضرت تصنیف فرما چکے ہیں۔ اور اس طرح شمار نہیں کیا، کہ مثلاً بارہ جلدیں تفسیر کی ہیں، وہ بارہ شمار کی گئی ہوں، بلکہ ان کو ایک ہی کتاب قرار دے کر پانچ سو انتیس ہوتی ہیں۔ اور خدا ہی جانتا ہے، کہ ان بارہ سالوں میں اور کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ افسوس ہے، کہ ان سطروں کی کتابت کے بعد خدا کی یہ رحمت

خزانہ رحمت کی طرف منتقل ہوگئی، اللهم المغفره۔

(مسلمانوں کا نظامِ تعلیم وتربیت، ص ٦٦)

☆☆☆

بنام: علامہ سید سلیمان ندوی

سید صاحب کی حضرت تھانوی سے بیعت کی خبر

ہاں صاحب! مشہور تو یہ ہوگیا، کہ بالآخر آپ نے بھی ایک دیوبندی (مولانا تھانوی) کے ہاتھ میں ہاتھ دے ہی دیا، کیا یہ صحیح ہے؟۔ خدا کرے صحیح ہو۔

(مکاتیب گیلانی، ص ۳۰۲)

☆☆☆

تھانہ بھون کی حاضری پر سید صاحب کو مبارک باد

بحمد اللہ! علم کی دولت کے ساتھ معرفت وعمل کی دولت بھی آخر میں آپ کے لیے مقدر تھی۔ آستانۂ تھانہ بھون کی حاضری کا حال مولانا عبدالباری صاحب سے معلوم ہوتا رہتا تھا۔ 'ھنیًا لکم ثم ھنیًا لکم الصادقین '' کی معیت آپ کو مبارک ہو۔ ''انعمت علیھم '' کے صراط کی ہدایت اصل ہدایت ہے۔ غضب اور ضلالت سے نجات کی واحد راہ بھی ہے۔ ''حسن اولک رفیقا '' کی سند کے ساتھ ''الرفیق الاعلیٰ '' کی مجلس، اس کی شرکت ہر قسم کی مجلس سے گزرنے کے بعد انشاء اللہ رسوخ تام کی بشارت وضمانت کی حامل ہے۔

عجیب بات ہے، کہ نہ یہاں محاسدہ ہے نہ مباغضہ اور نہ منافسہ اور نہ مقائبہ، بلکہ ہر ایک دوسرے کے لیے داعی، گو مدت ہوئی اس راہ سے دور ہو چکا ہوں، لیکن اب تک وہ حلاوتیں دلِ ناکام کو

یاد ہیں۔ جو کسی زمانے میں میسر آئی تھیں۔ آپ لوگوں کی انقلابی زندگی خیر کی طرف اور میرا انقلاب شر کی طرف، باعثِ عبرت ہے۔

مولانا عبدالباری تو اپنے اہل وعیال کے ساتھ غالباً تھانہ بھون روانہ ہو چکے ہوں گے۔ وہ خانقاہِ امدادیہ میں براج رہے ہیں۔ اور میں گیلانی میں بہاری شادیوں کی ظلمتوں میں مبتلا ہوں۔ بہ ظاہر زندگی کے آخری دنوں میں ان مکروہ مشاغل کے ساتھ ابتلا میرے لیے سخت ابتلا ہے، کہ ''العبرۃ بالخواتیم'' ہوسکتا ہے، کہ آپ جیسے ''الصالحین'' کی محبت وعقیدت میرے حسنِ عاقبت کی وجہ بن جائے والسلام۔

(ص، ۳۱۳۔۳۱۴)

☆☆☆

اجازت وخلافت کا مفہوم

۳/فروری ۱۹۴۳ء جامعہ عثمانیہ/ ۷ محرم ۶۲ھ، پنجشنبہ

سیدی الامام بشری لکم وطوبیٰ.....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ایں قالب فرسودہ گر از کوئے تو دوست

القلب علیٰ بابک لیلا ونہارا

کچھ عجب حال ہے جب آپ کی زیارت موجب اجر وثواب بنی تو جسے ثواب واجر کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہی اس سعادت سے محروم ہے۔ آپ کہاں سے کہاں پہنچے، اور پہنچائے گئے، اور ہم جرسِ کارواں کی صرف آواز ہی سنتے رہے۔ مولانا عبدالباری صاحب سے ''والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا'' کی جو تفسیر آپ کے ساتھ ہو رہی ہے اس کی خبریں سنتا رہتا ہوں، کتنی مسرتیں ان خبروں میں اپنے لیے پاتا ہوں، آپ کو اس کا اندازہ کیا ہوگا؟ خبر ملی تھی کہ آستانہ حکیم الامت حضرت تھانوی سے سندِ خلافت بھی حاصل ہو چکی ہے۔ معارف کے شذرات میں جو کچھ جس قلم سے

شائع ہوا ہے اب اس کی عبدیت اور بندگی میں کون شک کرسکتا ہے۔ بندے نے بندے کے بندے ہونے کی توثیق کی، میرے نزدیک تو خلافت کا حاصل ترجمہ یہی ہے۔ سب کچھ نگاہوں سے ہٹ جائے اور۔

از خدا خواہم ودر خیر نخواہم بخدا
کہ نیم بندہ غیر د ،نہ خدائے دگر است

(ص،۳۱۵)

☆☆☆

رِند کے رِندر ہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

۳/ مارچ ۱۹۴۳ء۔۱۴/صفر ۶۲ھ حیدر آباد دکن

سید الکریم زادکم اللہ عرفانا وقربا.....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

یقیناً ہم زمینوں کے حدود سے اب بہت بلند ہو چکے ہیں۔ یوں ہی بلندی کیا کم تھی اور اب تو ماشاءاللہ حکیم الامت مدظلہ العالی کی نیابت وخلافت کی دولت سے سرفراز ہیں۔ چالیس سال تک مولوی شبلی صاحب کی نیابت اور عمرِ عزیز کے چہل سال کے بعد مولانا تھانوی کی ع

رِند کے رِندر ہے ہاتھ سے جنت نہ گئی

عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ یاد آیا، کہ خلافت کے زمانے میں لباس کی قیمت چند درہم سے آگے نہ بڑھی۔ پوچھنے والے نے ولید اور عبدالملک کی گدی پر بیٹھنے والے سے پوچھا، مشہور جواب ہے، کہ ''تمنا کی مدینے کی ولایت کی، پوری ہوئی۔ فاطمہ بنتِ عبدالمالک سے شادی کی پوری ہوئی، اب جنت کی تمنا کی باری ہے، صرف اس کا سامان ہے۔ آپ نے بھی وہی کیا۔ والمثل ھٰذا فلیعمل العاملون بارک اللہ فیکم وعلیکم۔

(مکاتیب گیلانی، ص ۳۲۵۔۳۲۸)

دیوبندیت کے امتیاز پر بھی قبضہ

آپ نے تو دیوبندیت کے امتیاز پر بھی قبضہ کرلیا، اب ہم غریبوں کے پاس کیا رہ گیا ہے بجز اس کے: ع

تو شاد گفتہ بفرماں دہی دمن بغلامی

خیال آتا ہے اور اس کو آنا چاہیے، لیکن حافظ کان میں کہتے ہیں:

تو بہ تقصیر خود افتادی ازیں در محروم
از ، کہ می نالی وفریاد چرامی داری
اے دلِ خام شرے ازیں قصۂ بدار
کار نا کردہ چہ امید عطامی داری

اور سچ تو یہ ہے جیسا، کہ میرے چھوٹے بھائی مظہر سلمہٗ نے کہا، کہ ''سید صاحب تو ہمیشہ سے وہی تھے جس کی تصدیق مولانا تھانوی (متع اللہ المسلمین بطول بقائہ) نے فرمائی۔ وہ باہر سے زبردستی کچھ دن کے لیے وہ بنے رہے جو وہ نہیں تھے''۔

علی گڑھ کے امتیاز سے تھانہ بھون کے امتیاز کا دل پر زیادہ اثر اور وزن ہے۔

(مکاتیب گیلانی، ص ۲۳۴)

☆☆☆

مولانا تھانوی کے وصال پر
تعزیتی خط، علامہ سید سلیمان ندوی کے نام

خدا جانے آپ کہاں ہیں، دلّی کی گلیوں میں آپ کو ڈھونڈا، اس لیے ڈھونڈا ڈھونڈنا تھا، کہ مل

کر رووں گا، اس یتیمی پر، جو باپ کے مرنے کے بعد پھر دہرا دی گئی ہے۔ مفتی (مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی) صاحب سے معلوم ہوا، کہ آپ کو بھوپال میں روک لیا گیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کی مجلسِ شوریٰ میں شریک ہونے کے لیے دیوبند گیا تھا، کیا معلوم تھا، کہ دیوبند کی مجلسِ ماتم میں شریک ہونا میرے لیے مقدر ہو چکا ہے۔ راستہ میں معلوم ہوا تھا، کہ آپ بھوپال آئے ہوئے ہیں۔ غالباً دلّی میں، بہرحال آپ کو وہ غم مبارک ہو، جو انشاء اللہ سرمایۂ نشاط و سرور ہے، بڑے بلند اختر آپ نکلے، وقت سے پہلے جاگے، ٹھیک جس وقت مجلسِ شوریٰ کا اجلاس شروع ہوا دارالعلوم میں جماعتِ دیوبند کے اس ستونِ اعظم کے انہدام کی خبر مدرسہ پہنچی جو بحمد للہ انہدام میں تعمیر ہے۔ لیکن دنیا والوں کے لحاظ سے انہدام ہی سمجھا گیا۔ حیدرآباد جب واپس ہوا تو مولانا عبدالباری صاحب کو بہت متاثر پایا۔ تقریباً نیم جنونی حالت میں، مبارک ہے یہ جنون، خدا ہی جانتا ہے آپ کس حال میں ہوں گے۔ خواجہ ہمارے تو (عزیز الحسن غوری) مجذوب تھے ہی، سنا ہے، کہ کئی دنوں تک اپنے آپ میں واپس نہ ہوئے۔ معلوم نہیں اب کیا حال ہے۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق دارالعلوم دیوبند میں عند التعزیت (۱) جو ارتجالی تقریر خاکسار نے کی تھی، ''صدق'' میں شاید وہ نظر سے گزرے، مولانا مسعود علی ندوی صاحب کی خدمت میں سلام فرما دیجیے۔ تعزیت کے ساتھ انہیں اس مبارک و مسعود حزن و غم کی تہنیت دیتا ہوں، ہر ایک کا مقدر اتنا اونچا نہیں ہے، جسے یہ غم نصیب ہو، ایسے کتنے ہیں۔

(مکاتیب گیلانی، ص ۳۴۱۔۳۴۵)

(۱) یہ تعزیتی مضمون اب رسالہ کے آغاز میں شامل ہے۔

☆☆☆

بنام:عبدالباری ندوی

۱ مولانا تھانوی کا استعفاء

مولانا اشرف علی صاحب کا استعفاء میں بھی چھپا ہے۔جو گیلانی میں ملا۔اب دونوں طرف سے ''ملاعنہ اور مباہلہ'' کے حدود شروع ہو گئے ہیں۔حق تعالیٰ کا شکر بجالایا، کہ اس طوفان وفتنہ سے اس نے اپنے ایک غریب بیکس بندے (مناظر احسن گیلانی) کو بچا لیا۔اثباتی کامیابیاں نہ سہی ،لیکن بدبختیوں سے بچنا بھی بڑی کامیابی ہے۔آج اس سے بڑی بدبختی کیا ہوسکتی ہے، کہ دنیائے اسلام کے دو بزرگوں (مولانا تھانوی اور مولانا مدنی) میں سے کسی ایک کے قلب مبارک میں کچھ سوء دوسرے کی طرف سے پیدا ہو۔(فالحمد لله الذی نجانی من القوم الظالمین)

(مکاتیب گیلانی،ص۱۸۳)

☆☆☆

حضرت تھانوی کی صحت

حضرت مولانا تھانوی مدظلہ العالی کی صحت وعافیت کی خبر جہانیوں کی صحت و عافیت کے مترادف ہے۔

(مکاتیب گیلانی،ص۲۳۴)

☆☆☆

حضرت تھانوی کے حالات

مولانا عبدالباری ندوی کے خط میں

آپ کے گرامی نامہ کا وہ حصہ جس میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے آخری حالات کے متعلق بعض مفید معلومات درج ہیں، میں ''صدق'' میں بھیج رہا ہوں۔

(مکاتیب گیلانی، ص ۲۳۹)

☆☆☆

حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑنے والا

اور حکیم الامت کا صحبت یافتہ

بلاشبہ یہ حق تعالیٰ ہی کا فضل ہے لیکن اس کے فضل کے ظہور کی شکل اللہ والوں کی صحبت ہوئی ہے۔ حضرت مدنی کا ہاتھ پکڑنے والا اور حکیم الامت کی صحبت طیبہ سے استفادہ کرنے والا کیا محروم رہ سکتا ہے؟۔ اور سب سے بڑی ولایت کا سایہ تو آپ پر اُن ہی اقدام کا سایہ ہے جس کے نیچے آپ کی جنت ہے، میرا بہت بہت سلام والدہ صاحبہ سے عرض کر دیجیے۔ دعاؤں کا سخت محتاج ہوں۔

(مکاتیب گیلانی، ص ۲۶۰)

☆☆☆

حضرت تھانوی سے مراسلت

ادھر خلافِ معمول حضرت تھانوی مدظلہ العالی سے مراسلت کی آخر مجھے جرأت ہو ہی گئی اور

جب جرأت ہوئی تو خوب ہوئی، خدا کا شکر ہے، کہ چند خطوط کی آمد و رفت نے دل کے بہت سے کانٹے نکال دیے۔ حضرت سے دینی ہی نہیں بلکہ بعض دنیاوی مسائل میں بھی مشورہ طلب ہوا تھا(۱)۔ ہر ایک کا شافی حکیمانہ جواب ''ماقل ودل عطا'' فرمایا گیا۔ کلیاتِ اشرفیہ میں ان دنوں مجھ پر'' قادر بقدرتِ غیر قادر نہیں ہے'' کا زیادہ اثر ہے، کہ چند دنیاوی مشکلات کا حل اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ مسئلۂ خاص (۲) کے متعلق حضرت نے خلافِ معمول اطناب سے اپنے مکاتیب میں کام لیا۔ بحمد للہ! اس سے مجھے نفع پہنچا، لیکن اب تک اس باب میں تشفی نہ ہوئی، کہ اتنا ستر اس کے لیے کیوں ضروری قرار دیا جارہا ہے(۳)۔

حواشی

(۱) جی ہاں! جن کو تجربہ ہے خوب جانتے ہیں، کہ حضرت دنیاوی مسائل و مشکلات کے بھی ماشاء اللہ بڑے مشکل کشا تھے۔ (ع)

(۲) مولانا کے ذوق کا خاص مسئلہ وحدت الوجود مراد ہے (ع)

(۳) حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک یہ مسئلہ ضروریاتِ دین میں تو کسی درجے میں تھا نہیں اور فتنوں یا غلط فہمیوں سے اس کی کوئی تعبیر بھی مشکل ہی سے خالی ہوتی ہے اس لیے تعمیم پسند نہ فرماتے تھے۔ مکتوب علیہ (علامہ گیلانی) نے ایک مرتبہ تھانہ بھون حاضری کے موقع ہی پر اس باب میں بالمشافہ جی کھول کر استفادہ کیا تو سب سے پہلے اپنا (حضرت تھانوی) ایک مطبوعہ رسالہ عطا فرمایا، جو اسی مسئلہ پر تھا۔ مگر مطبوعہ ہونے پر بھی اشاعت عام نہیں بہت خاص ہی تھی۔ (ع)

(مکاتیب گیلانی، ص ۳۲۱۔۳۲۲)

☆☆☆

تنقید، تنقید کی غرض سے

حکیم الامت (۱) کے متعلق انشاء اللہ آپ کا قلم لکھے گا۔ حق تعالیٰ سے امید ہے، کہ وہ ایسی چیزیں لکھوادیں گے جو دوسروں کے لیے قابلِ نمونہ و پیروی ہو۔ اللہ میاں پیمبروں کو بجائے ملائکہ کے بشر مان کر اسی لیے بھیجتے ہیں، کہ بشر کو دیکھ کر بشر اپنی راہ درست کر سکے، مگر لوگوں کو کیا کہیے، ان کا وہی پرانا جاہلی مغالطہ'' کیا

ہماری رہنمائی یہ بشر کریں گے''؟۔ پھر وہ خدا کا بیٹا، خدا کا اوتار بلکہ پیمبروں کو نعوذ باللہ خدا بنانے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اور آدمی کی صفات رکھنے والے آدمی کی اقدار کو توہین خیال کرتے ہیں اور اپنی رہنمائی کے لیے فوق البشر چاہتے ہیں۔ بہر حال! آپ لکھیے، اور حق کو ظاہر کیجیے، مگر اس زمانے کے رواج یعنی تقریظ کی بجائے ڈھونڈ کر زبردستی عیب نکالنا جس کو میں ''بٹ ماری'' کہتا ہوں، سے بچنے کی ضرورت ہے۔ آپ کی فطری سلامت روی پر بھروسہ ہے۔

(۱) مولانا عبدالماجد دریابادی کی کتاب ''حکیم الامت نقوش وتاثرات'' کے بارے میں مشورہ۔

(مجموعۂ خطوطِ گیلانی، ص ۳۹۰۔۳۹۱/ ماخوذ ہفت روزہ ''صدق'' لکھنؤ، ۱۵/نومبر ۱۹۴۳ء)

☆☆☆

حضرت تھانوی کا ذکر دیگر مقامات پر

ایک اشاریہ

مقالات احسانی/علامہ سید مناظر احسن گیلانی/ادارہ مجلسِ علمی کراچی

صفحہ.....۲۳۶

سوانح قاسمی جلد اوّل/علامہ سید مناظر احسن گیلانی

صفحات ۴۹.....۶۹.....۷۸.....۸۲.....۸۳.....۱۱۶.....۱۲۵.....۱۵۳.....۱۹۱.....۲۲۳.....۲۴۱.....
۲۴۳.....۲۵۸.....۳۳۳.....۳۴۶.....۳۶۵.....۳۶۹.....۳۷۳.....۳۷۷.....۳۸۶.....۳۹۳
.....۳۹۴.....۳۹۹.....۴۱۴.....۴۴۷.....۴۵۱.....۴۵۴.....۴۶۶.....۴۷۲.....۴۷۳.....۴۷۶
.....۴۷۸.....۴۷۹.....۴۸۱.....۴۸۴.....۵۵۹.....۵۶۸۔

سوانح قاسمی جلد دوم:

صفحات ۱۵۳.....۱۵۴.....۲۳۹.....۲۴۰.....۲۹۹.....۳۷۱۔

سوانح قاسمی جلد سوم:

۱۱.....۸۱.....۱۲۲.....۱۴۸۔

(مکتبہ رحمانیہ اردو بازار لاہور)

سیرت بانی دارالعلوم

مولانا محمد قاسم نانوتویؒ

کی حیات وخدمات پر ایک سرسری نظر

علامہ سید مناظر احسن گیلانیؒ

☆

مرتب

محمد عامر قمر

ناشر

مجلس یادگار گیلانی

ڈی۔۴۸، گلی نمبر ۳، سیکٹر ساڑھے گیارہ اورنگی ٹاؤن کراچی